

# جہاد و القرآن

اس کے پانچ حصے

ڈاکٹر محمد امجد



مکتبہ خدام القرآن لاہور



# جہاد بالقرآن اور اس کے پانچ محاذ

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب و تسوید:

شیخ جمیل الرحمن

شائع کردہ:

تنظیم اسلامی

مرکزی دفتر: A-67 علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور۔ 54000  
فون: 36313131، 36293939، 36316638، 36366638 فیکس: 36313131  
ای میل: [www.tanzeem.org](http://www.tanzeem.org) [markaz@tanzeem.org](mailto:markaz@tanzeem.org)

## پیش لفظ (طبع اول)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ، صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن وامیر تنظیم اسلامی نے جہاد حقیقت جہاد غایت جہاد اور دین میں جہاد کا مقام کے موضوعات پر متعدد تقاریر کی ہیں۔ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے حصہ چہارم میں ”تواصی بالحق“ کے عنوان کے ذیل میں سورۃ الحج کا آخری رکوع، سورۃ الصف (کمل)، سورۃ الجمعۃ (کمل)، سورۃ التوبۃ کی آیت ۲۴ اور سورۃ المنافقون (کمل) شامل ہیں جن پر ڈاکٹر صاحب موصوف نے متعدد دروس دیے ہیں جن میں جہاد کی اہمیت و فرضیت پر سیر حاصل بحث ہوئی ہے۔

اس عاجز کی معلومات کی حد تک سورۃ الفرقان کی آیت ۵۲ کی روشنی میں ”جہاد بالقرآن“ کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کا یہ پہلا مفصل خطاب ہے جو موصوف نے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے چھٹے سالانہ محاضرات قرآنی کے افتتاحی اجلاس منعقدہ ۲۵ مارچ ۱۹۸۴ء میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس اجلاس کی صدارت بر عظیم پاک و ہند کی مشہور و معروف دینی و علمی شخصیت جناب مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ العالی مدیر ماہنامہ برہان دہلی، مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند (بھارت) کے رکن، شیخ الہند اکیڈمی (بھارت) کے ڈائریکٹر نیئر مدرسہ عالیہ کلکتہ (بھارت) کے سابق پرنسپل اور متعدد دینی و علمی اور تحقیقی کتب کے مصنف و مؤلف نے فرمائی تھی۔ علاوہ ازیں اس اجلاس میں ملک کے بعض جید علماء عظام اور دانشوران کرام بھی شریک تھے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ خطاب انتہائی پُر تأثیر نہایت مدلل اور خطابت کی معراج تھا۔ کسی تقریر خطاب یا درس کو ٹیپ سے صفحہ مرقطاس پر منتقل کرنا کافی مشکل کام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق سے یہ کام انجام پاتا ہے۔ لیکن تحریر میں مقرر کا زور خطابت، الفاظ کی ادائیگی کا زیور، ہم اس کی اپنی شخصیت کا اثر، دوران تقریر الفاظ کی ادائیگی کا خاص طرز اور ان پر زور ہاتھوں کی حرکات و سکنات کا انداز اور مجموعی طور پر ان سب کا سامعین پر جو گہرا اثر قائم ہوتا ہے اسے تحریر میں سمونا ممکن نہیں ہے۔ آڈیو کیسٹ کی سماعت سے بعض باتوں کی کچھ نہ کچھ تلافی ضرور ہوتی ہے البتہ ویڈیو کیسٹ بڑی حد تک ان سب کا بدل ہو سکتا ہے لیکن افسوس کہ اس خطاب کے ویڈیو کیسٹ تیار نہ ہو سکے۔

بہر حال اس عاجز کی ناچیز رائے میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ خطاب ان کے بہترین خطابات میں سے ایک ہے اور ”دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے“ کا مرقع۔ علامہ اقبال نے

کہا تھا ”اپنے من میں ڈوب کر پاجاسراغ زندگی“..... ڈاکٹر صاحب موصوف نے قرآن مجید میں غوطہ زن ہو کر اس بحر بے کنار میں سے معارف و عرفان اور حکم و عبر<sup>(۱)</sup> کے کچھ دُر شہوار<sup>(۲)</sup> نکالے ہیں جو اس خطاب میں آپ کو نظر آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کے بارے میں سچ فرمایا تھا الصادق المصدوق ﷺ نے: ((وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلُقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقُضِي عَجَائِبُهُ)) ”علماء کبھی اس کتاب سے سیر نہ ہو سکیں گے نہ کثرت تکرار سے اس کے لطف میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات (یعنی نئے نئے علوم و معارف و بصائر کے خزانے) کبھی ختم ہو سکیں گے۔“

محاضراتِ قرآنی کے بعد رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ (جون ۱۹۸۴ء) کے دو اجتماعاتِ جمعہ میں مسجد دارالسلام لاہور میں ”جہاد بالقرآن“ کے موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب نے دو خطابات مزید ارشاد فرمائے تھے۔ گویا جو کلی ۲۵ مارچ کو کھلی تھی اس نے شگفتہ پھول کی شکل اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ ان میں سے آخری خطاب کا عنوان تھا: ”جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ“..... یہ خطاب بھی اس عاجز نے کیسٹ سے منتقل کر لیا تھا اور اب اسے بھی معمولی حک و اضافہ کے بعد اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔

یہ دونوں خطابات محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کی نظر ثانی کے بغیر شائع کیے جا رہے ہیں۔ البتہ ان میں سے دوسرے خطاب (جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ) پر قرآن الکیڈمی کے فیلو حافظ خالد محمود خضر نے نظر ثانی کر کے اسے مزید بہتر بنانے میں تعاون فرمایا ہے۔ جَزَاهُ اللَّهُ أَحْسَنَ الْجَزَاءِ۔ ان میں جو صواب<sup>(۳)</sup> ہے وہ من جانب اللہ ہے اور اگر کوئی خطا ہے یا اظہارِ مدعا میں کوئی تقصیر ہے تو اس کی ذمہ داری اس عاجز کے ناتواں کاندھوں پر ہے جس کے لیے یہ عاجز بارگاہِ رب العزت میں دست بدعا ہے: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَاْنَا

مزید دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو حسن نیت، حسن عمل اور اپنے دین حق کا صحیح فہم نیز اس کی صحیح خدمت کی توفیق و سعادت سے بہرہ ور فرمائے، ڈاکٹر صاحب موصوف کی مساعی جلیلہ و جلیلہ کو دنیا و آخرت میں مشکور فرمائے، نیز اس عاجز کی جانب سے اس کام میں اس حقیر سے تعاون کو اس کے لیے توشہ آخرت بنائے۔

فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنْتَ وَلِيِّ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا  
وَالْحَقِّنِي بِالصَّلَاحِ جَنَّ - آمِينَ يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ!!

احقر جمیل الرحمن عفی عنہ ۱۰/رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ

## دیباچہ

فکر اسلامی کے حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی تجدیدی مساعی اور علمی و تحقیقی کاوشوں کا ایک موضوع ”جہاد فی سبیل اللہ“ بھی تھا۔ آپ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے اسلام کے اس عظیم فریضے کے حقیقی تصور، مراحل، لوازم اور اقسام کو واضح کرنے کیلئے تادم آخر ”جہاد باللسان والقلم“ میں مصروف رہے۔ زیر نظر کتابچہ بھی اسی جہد مسلسل کا ایک مظہر ہے جو کہنے کو اگرچہ مختصر کتابچہ ہے لیکن معنویت و جامعیت کے اعتبار سے کئی کتابوں پر بھاری ہے۔

ایک مسلمان کے بنیادی فرائض، ان کی ادائیگی کا طریق کار، اس کیلئے درکار جہاد اور ان اقسام جہاد میں قرآن حکیم کا کردار اس کتابچے میں بہت ہی مختصر مگر جامع انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ دعوت دین کے ایک عام کارکن سے لے کر بڑے سے بڑا مبلغ و مدرس بھی اس بات کا شدت سے محتاج ہے کہ وہ اپنے معاشرے اور مخاطبین کے ذہنی و فکری اشکالات اور معاشرے کے گمراہ کن نظریات سے واقفیت رکھتا ہو تبھی وہ دعوت و تبلیغ کا حق ادا کر سکتا ہے ورنہ اس کی دعوت اندھیرے میں چلائے گئے تیر کی مانند بے ہدف ہی رہے گی۔ زیر نظر کتاب کے آخری حصے ”جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ“ کے زیر عنوان موجودہ معاشرے کے مسائل اور جدید ذہن کے اشکالات کو بڑی مہارت سے واضح کیا گیا ہے۔ داعیان دین کیلئے یہ حصہ رہنما اصول کا درجہ رکھتا ہے۔ ان چند امور کے پیش نظر بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ آجنگاہ کی اس مختصر کتاب کی احتیاج و ضرورت ایک عام مسلمان سے لے کر عالم دین تک سبھوں کو ہے۔

موجودہ ایڈیشن میں بعض مشکل الفاظ کے معانی اور احادیث مبارکہ کے حوالہ جات حاشیے میں لکھنے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے جو اگرچہ اہل علم پر گراں گزرے گا لیکن عوام الناس کیلئے اس کی ضرورت کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔

زیر نظر مقالے کے خالق مجازی، ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور اس کے مرتب اولیں جناب شیخ جمیل الرحمنؒ، دونوں اپنے رب کے حضور پہنچ چکے ہیں۔ ہم رب کریم سے دعا گو ہیں کہ حق تعالیٰ ان دونوں صاحبان سے راضی ہو، ان کی حسنات کو قبول فرمائے اور ان کے اس علمی صدقہ جاریہ میں مزید برکت ڈالے۔

(رحمت اللہ بڑ)

ناظم دعوت و تربیت

17 جولائی 2012ء

## عنوانات

7	..... <b>جہاد بالقرآن</b>
9	..... جہاد اور قرآن: دو مظلوم ترین حقیقتیں
12	..... فرائض دینی اور جہاد کی منازل
12	..... پہلی منزل: عبادتِ رب
14	..... پہلی منزل کے تین جہاد
18	..... دوسری منزل: شہادت علی الناس
23	..... دعوت و تبلیغ کی تین سطحیں
30	..... تیسری منزل: غلبہ و اقامتِ دین
33	..... اقامتِ دین کا مرحلہ اور تصادم
38	..... ایمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں
41	..... جہاد کی چوٹی: قتال فی سبیل اللہ
44	..... جہاد کے لیے جدید اصطلاح: انقلابی عمل
45	..... انقلابی عمل کے لیے تنظیم ناگزیر ہے
51	..... انقلابی دعوت و تربیت اور اس کا ذریعہ

- 62 ..... **جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ**
- 63 ..... **✽ محاذ اول: جاہلیت قدیمہ**
- 64 ..... جاہلیت قدیمہ کے اجزائے ترکیبی
- 67 ..... جاہلیت قدیمہ کے خلاف قرآن کی تلوار کا استعمال
- 70 ..... **✽ محاذ دوم: جاہلیت جدیدہ**
- 71 ..... جاہلیت جدیدہ کا ذکر قرآن میں
- 74 ..... جاہلیت جدیدہ کے لامحدود گوشے
- 76 ..... **✽ محاذ سوم: بے یقینی**
- 78 ..... علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی!
- 79 ..... نوروجی سے قبل آنحضور ﷺ کے ایمان کی ماہیت
- 80 ..... دلکش ترین ایمان کس کا ہے؟
- 82 ..... **✽ محاذ چہارم: نفس پرستی اور شیطانی ترغیبات**
- 84 ..... کشہ شمشیر قرآنش کنی
- 88 ..... **✽ محاذ پنجم: فرقہ واریت**
- 89 ..... اعتصامش کن کہ جبل اللہ دوست
- 92 ..... حاصل کلام

# جہاد بالقرآن

الحمد لله وكفى والصلوة والسلام على عباده الذين اصطفى ..... أما بعد:

فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم — بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿فَلَا تَطْعَمُ الْكُفْرَيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا﴾ (فرقان: 52) صدق الله العظيم

خطبہ مسنونہ تلاوت آیات اور ادعیہ ماثورہ کے بعد :

جس آیت مبارکہ کی میں نے تلاوت کی ہے اس میں دو چیزیں نہایت اہم ہیں۔ ایک لفظ ”جہاد“ جو اس آیت مبارکہ میں دو مرتبہ آیا ہے ایک فعل امر کے طور پر ”جَاهِدْ“ اور دوسرے مفعول مطلق کے طور پر ”جِهَادًا كَبِيرًا“۔ یعنی نہ صرف جہاد بلکہ شدید جہاد بہت بڑا جہاد۔ یہاں دوسرا اہم لفظ ”بِهِ“ آیا ہے۔ اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا﴾<sup>(۱)</sup> ”آپ ان سے جہاد کیجئے اس (قرآن) کے ذریعے سے بہت بڑا جہاد“۔

یہاں ”بِهِ“ کا جو چھوٹا سا ٹکڑا آیا ہے میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اکثر و بیشتر ہمارے اہل علم حضرات بھی اس کی اہمیت پر غور و فکر کیے بغیر سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ جہاں بھی قرآن کے لیے ”بِهِ“ بطور ضمیر مجرور آیا ہے ہمارے اہل علم الا ماشاء اللہ اس کا حق ادا نہیں کرتے۔

اس ”بِهِ“ کی اہمیت کے اظہار کے لیے دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

پہلی مثال سورہ بنی اسرائیل سے ہے جہاں فرمایا ﴿وَمِنَ الْاَيْلِ فَتَهَجِدُ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ﴾<sup>(۲)</sup> ”اور (اے نبی!) کچھ رات جاگتے رہیے اس (قرآن) کے ساتھ یہ بڑھوتری ہے آپ کے لیے“۔ میرا اندازہ ہے کہ تہجد کی فضیلت اس کی اہمیت اور اس کا مقام و مرتبہ تو



ہمارے یہاں معروف اور مشہور ہے کسی کو اس کی توفیق ملی ہو یا نہ ملی ہو، لیکن اس کی عظمت اور برکات سے ہر وہ مسلمان بخوبی واقف ہوگا جس کا تھوڑا بہت بھی دینی مزاج ہے۔ لیکن یہاں بھی ”یہ“ پر اتنی توجہ نہیں ہوتی جتنی ہونی چاہیے۔ تہجد میں اہم ترین شے قیام بھی طویل قیام اور اس میں ترتیل کے ساتھ تلاوت قرآن ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الْمَزْمِلُ ﴿قُمْ الْكَلِّ إِلَّا قَلِيلًا ﴿نَّصْفَهُ أَوْ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ﴿أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ﴿﴾﴾﴾ (المزمل)

”اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو، مگر کم، آدھی رات یا اس سے کم کر لو یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔“

لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ اس کا اہتمام کرتے ہیں عموماً وہ عام نوافل کی طرح آٹھ رکعتیں پڑھ لیتے ہیں، پھر بیٹھ کر مختلف اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے ہیں اور زیادہ وقت اس میں صرف کرتے ہیں (اللہ ماشاء اللہ)۔ یہ بھی بہت غنیمت ہے، لیکن اس کی برکات سے کما حقہ استفادہ تب ہوگا جب اس میں طویل قیام ہو اور اس میں ترتیل کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت ہو۔

دوسری مثال سورہ مریم کی ہے جہاں فرمایا:

﴿فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لِّدَارٍ﴾

”پس یقیناً (اے نبی!) اس کلام کو ہم نے تمہاری زبان میں آسان کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم اس (قرآن) کے ذریعے پرہیزگاروں کو خوشخبری دے دو اور ہٹ دھرم لوگوں کو اس کے ذریعے سے خبردار کرو۔“

یہاں بھی غور فرمائیے کہ تبشیر و انذار کے لیے قرآن مجید ہی کو ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ہوتا کیا ہے! یہ کہ ہمارے یہاں وعظوں اور خطبوں میں اکثر و بیشتر یہ کام اولیاء اللہ کے تذکروں یا مولانا روم کی مثنوی سے لیا جاتا ہے۔ قرآن کی طرف بہت ہی کم توجہ دی جاتی ہے۔ بعینہ یہی معاملہ زیر نظر آیت کریمہ کا ہے: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا﴾ معلوم ہوا کہ یہاں جس جہاد کا حکم دیا جا رہا ہے اس شد و مد کے ساتھ اس اہتمام کے ساتھ اس

تاکید و زور (emphasis) کے ساتھ تو اس کے لیے ایک ذریعہ ایک آلہ ایک ہتھیار ہے جو جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو عطا ہوا ہے۔ اس کے لیے بھی ایک تلوار ہے جو آپ کے دست مبارک میں تھمائی گئی ہے اور وہ ہے قرآن حکیم۔ لہذا ارشاد ہوا: ”اور (اے نبی!) ان (مشرکین و کفار) کے ساتھ جہاد کیجیے اس (قرآن) کے ذریعے سے بہت بڑا جہاد“۔

### جہاد اور قرآن: دو مظلوم ترین حقیقتیں

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے قبل یہاں لفظ ”جہاد“ کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے۔ پہلی بات یہ کہ میرے نزدیک جہاد ہمارے دین کا مظلوم ترین تصور (concept) ہے۔ مظلوم ہونے کے اعتبار سے اس کے ہم پلہ دوسری شے جو آتی ہے وہ قرآن ہے۔ ہمارے دین کی یہ دو مظلوم ترین حقیقتیں ہیں۔ جہاد کے بارے میں اتنے مغالطے ذہنوں میں ہیں کہ حد و شمار نہیں۔ پھر خاص طور پر ہماری تاریخ میں ایک دور وہ بھی آیا کہ جب ہم براہ راست محکوم ہوئے نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہنی و فکری اعتبار سے بھی۔ یعنی ہم دو طرفہ غلامی کے پنجے میں گرفتار ہوئے۔ اُس وقت اہل مغرب کی طرف سے ہم پر جہاد کے حوالے سے بڑے جارحانہ حملے ہوئے اور استہزاء و تمسخر کا معاملہ ہوا۔ انہی کا یہ الزام ہے کہ: ”بوائے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!“ چنانچہ اس ضمن میں ہمارا انداز معذرت خواہانہ (apologetic) رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ اب یہ دور اصلاً گزر چکا ہے، لیکن تاحال اس کے باقیات السینات<sup>(۱)</sup> کچھ لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں اور جب تک ہم اُن کو اچھی طرح کھرچ نہیں دیں گے اُس وقت تک دین کی کوئی مثبت پائیدار اور فعال تحریک جو نتیجہ خیز بھی ہو اٹھانا ممکن نہیں ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ جہاد کے بارے میں سب سے پہلا مغالطہ ذہنوں میں یہ بٹھا دیا گیا اور اس کے نتائج بہت دُور رس ہیں کہ جہاد کے معنی ”جنگ“ ہیں۔ اس بارے میں میری رائے ہے کہ اغیار اور بیگانوں کی کارستانی کے ساتھ ساتھ ریگانوں اور اپنوں کی بھی غلطیاں ہیں۔ اپنوں کی بڑی اکثریت نے بھی جہاد کو ”جنگ“ ہی قرار دیا جب کہ قرآن مجید مستقل

طور پر دو اصطلاحات استعمال کرتا ہے ایک ”جہاد فی سبیل اللہ“ اور دوسری ”قتال فی سبیل اللہ“۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر و بیشتر ہمارے دینی لٹریچر میں جنگ کے تمام مدارج و مراحل کے لیے بطور عنوان لفظ جہاد استعمال ہو جاتا ہے اور جنگ کو ”جہاد“ ہی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہوتے ہوتے ہمارے ذہنوں میں جہاد اور قتال مترادف کی حیثیت سے جاگزیں ہو گئے اور عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ جہاد کے معنی جنگ ہیں۔

تیسری بات یہ کہ ظاہر ہے جنگ ہر وقت اور ہمیشہ تو نہیں ہوتی، لہذا جہاد فرض کفایہ رہ گیا اور فرض عین کی فہرست سے خارج ہو گیا۔ جب کبھی جنگ کا مرحلہ آتا تھا تو جتنی نفری کی ضرورت ہوتی تھی وہ نکل آتی تو بقیہ لوگوں کی طرف سے وہ فرض ادا ہو جاتا تھا۔ یہی فرض کفایہ کا تصور ہے اور بالکل صحیح تصور ہے۔ لیکن جہاد و قتال کو مترادف سمجھ لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے یہاں جو فقہی تصورات و معیارات اور سوچ کے جو پیمانے ہیں ان میں جہاد گویا صفِ اول کی شے رہا ہی نہیں۔ اس کا فرض عین ہونا پس منظر میں چلا گیا، حتیٰ کہ ذہنوں سے اوجھل اور محو ہو گیا۔ **اللہ ما شاء اللہ!**

چوتھی بات یہ کہ اس پر ستم بالائے ستم اور بناء الفاسد علی الفاسد<sup>(۱)</sup> یہ ہوا کہ ہم نے یہ تصور کر لیا کہ مسلمان جب بھی جنگ کرے تو گویا وہ جہاد فی سبیل اللہ کر رہا ہے۔ حالانکہ ایک مسلمان ذاتی حیثیت سے جہاں فاجر و فاسق ہو سکتا ہے وہاں ظالم بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کا کوئی بادشاہ یا کوئی سربراہ یا کوئی گروہ ظالم بھی ہو سکتا ہے اور ایک ناحق جنگ بھی شروع کر سکتا ہے، صرف اپنے مفادات کے لیے صرف اپنے اقتدار کو وسعت دینے کے لیے اپنی حدودِ سلطنت کی توسیع کے لیے جبکہ اُن کے پیشِ نظر دین کی کوئی خدمت نہ ہو اعلائے کلمۃ اللہ کا کوئی مقصد نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی جنگ جہاد یا قتال فی سبیل اللہ کیونکر شمار ہو جائے گی جبکہ ہمارے سامنے نبی اکرم ﷺ کی یہ واضح حدیث موجود ہے:

عَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: الرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلدَّخْرِ وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ

لِيرِى مَكَانَهُ فَمَنْ فِى سَبِيلِ اللَّهِ؟ قَالَ: ((مَنْ قَاتَلَ لِسُكُونِ كَلِمَةِ اللَّهِ هِيَ الْعُلَا فَهُوَ فِى سَبِيلِ اللَّهِ)) (متفق عليه)

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا، اس نے دریافت کیا کہ حضور! ایک شخص جنگ کرتا ہے مالِ غنیمت کے لیے، ایک شخص جنگ کرتا ہے اپنے ذکر اور شہرت کے لیے اور ایک شخص جنگ کرتا ہے اپنی (یا اپنے قبیلہ کی) سر بلندی دیکھنے کے لیے، تو کس کی جنگ اللہ کے راستے میں ہوگی؟ حضورؐ نے (جواب میں) ارشاد فرمایا: ”صرف اس کی جنگ فی سبیل اللہ ہوگی جو اس لیے جنگ کرے تاکہ اللہ کا کلمہ سب سے بلند ہو جائے۔“

خیال رہے کہ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ تو قتال فی سبیل اللہ وہ جنگ ہے جو اللہ کے جھنڈے کی سر بلندی کے لیے کی جائے، نہ کہ ہر مسلمان کی یا مسلمانوں کی حکومت کی ہر نوع کی جنگ جہاد و قتال فی سبیل اللہ قرار دی جائے گی۔ بہر حال یہ ہیں وہ مغالطے جو کچھ تو اغیار کی کرم فرمائی سے اور کچھ اپنوں کی ستم ظریفی سے تہہ در تہہ ذہنوں میں بیٹھ گئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تصور کو نکھار کر سامنے لایا جائے کہ جہاد فی سبیل اللہ درحقیقت ہے کیا، اور جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ میں فرق کیا ہے!

میں نے اس پر بہت غور کیا کہ ایک عام اردو دان کے لیے وہ لفظ کون سا ہوگا جو لفظ جہاد کے مفہوم کو صحیح صحیح ادا کر دے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ لفظ جہاد باب مفاعله سے ہے اور باب مفاعله کے اکثر مصادر میں فریقین کی شرکت ہوتی ہے۔ پھر ایک دوسرے پر غالب آنے کا مفہوم بھی اس میں شامل ہوتا ہے، جیسے بحث سے مباحثہ، جہد سے مجاہدہ اور جہاد اور قتل سے مقاتلہ اور قتال۔ قتال میں بات دو طرفہ ہو جاتی ہے جبکہ قتل یک طرفہ عمل ہے۔ کوئی شخص جا رہا ہے، کسی نے گولی مار دی یا خنجر گھونپ دیا در آنحالیکہ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ یہ حادثہ ہو جائے گا، یہ قتل ہے۔ لیکن جب دو فریق آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہو جائیں تو یہ ان فریقین کے مابین قتال یا مقاتلہ ہے۔ اسی طرح جہد کا عمل ہے۔ یہ عام فہم لفظ ہے اور اردو میں کوشش کے معنی میں مستعمل ہے۔ اس سے جہاد و مجاہدہ کے معنی و مفہوم ہوں گے کوششوں کا تصادم

کوششوں کا ٹکراؤ، کوششوں کا مقابلہ — جس کے لیے ایک لفظ ہوگا ”کٹکاش“ یا ”کشا کش“۔ انگریزی میں اسے کہیں گے: struggle۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے بعد صلہ (preposition) کے طور پر against کا لفظ آتا ہے۔ یعنی کوئی رکاوٹ ہے، کوئی چیز درمیان میں راستہ روکنے والی ہے تو اسے ہٹانے اور دور کرنے کے لیے اس سے کٹکاش کرنا۔ درحقیقت جہاد یا مجاہدہ کا صحیح لغوی مفہوم یہی ہے۔

## فرائض دینی اور جہاد کی منازل

میں اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے اپنے غور و فکر کے نتائج پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس مسئلہ پر غور و فکر کے نتیجے میں جہاد کے تین بڑے بڑے درجے اور ہر درجہ کے تین پہلو یا تین قسمیں میرے سامنے آئی ہیں — میں ان کو اہل علم کے سامنے ان کی تائید و توثیق یا اصلاح کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ میں قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم ہوں، مجھے اہل علم کی رہنمائی حاصل ہونے پر دلی مسرت ہوگی۔ میں خلوص دل سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مجھ پر میری غلطی واضح کر دی جائے تو میں سر تسلیم خم کرنے میں ایک لمحہ کے لیے بھی تردد نہیں کروں گا، بلکہ غلطی کی نشاندہی کرنے والے صاحب کا صمیم قلب<sup>(۱)</sup> سے احسان مند ہوں گا۔

میرے نزدیک یہ تین بڑے بڑے درجے ان بنیادی فرائض سے متعلق ہیں جو ہمارا دین اپنے ماننے والوں پر عائد کرتا ہے۔ دین کی طرف سے ہر مسلمان پر جو تین بنیادی فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی بنیادی تفہیم کے لیے ایک تین منزلہ عمارت کی تمثیل یا تشبیہ بہت ہی مفید ہے۔

### پہلی منزل: عبادتِ رب

فرائض دینی کی پہلی منزل ہے خود اللہ کا بندہ بننا۔ اور یہ بندگی ہمہ وجوہ ہمہ تن اور ہمہ وقت ہوگی، جزوی نہیں ہوگی۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً﴾ (البقرة: ۲۰۸)

”اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے۔“

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَأَنِيبُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ﴾ (الزمر)

”اور اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اس کی فرمانبرداری قبول کرلو (اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دو) اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آجائے پھر تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔“

اس رویہ کا دینی اصطلاح میں نام ہے اسلام، سر تسلیم خم کرنا، گردن نہادن، to surrender۔ اسی کے لیے مزید دو اصطلاحات ہیں: اطاعت اور تقویٰ۔ اطاعت کا مفہوم ہے مقاومت<sup>(۱)</sup> و مدافعت ترک کر کے برضا و خوشی فرمانبرداری قبول کر لینا، جس کے لیے قرآن مجید میں بار بار حکم دیا گیا: ﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ ”اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی“۔ اسے انگریزی میں یوں کہیں گے:

”To give up all kinds of resistance whole heartedly.“

یعنی ”خوش دلی سے ہر نوع کی مقاومت و مزاحمت ترک کر دینا۔“

جبکہ ”تقویٰ“ کا مفہوم ہے اللہ کے احکام کو توڑنے سے بچنا، اس کی نافرمانی سے باز رہنا۔ تقویٰ کا حکم قرآن مجید میں بڑی تکرار اور تاکید سے آیا ہے۔ اس ضمن میں چوٹی کی آیت ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ (آل عمران)

”اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے اور تم پر موت نہ آئے مگر حالت فرمانبرداری میں۔“

اطاعت اور تقویٰ میں بالترتیب مثبت اور منفی رویہ سامنے آتا ہے۔ بات ایک ہی ہے۔ گویا ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔

اس پہلی منزل کے لیے چوتھی اور آخری جامع ترین اصطلاح ہے ”عبادت“۔ اس میں اسلام اطاعت اور تقویٰ کے تمام مفاہیم آ جاتے ہیں۔ اس لفظ عبادت کے سمجھنے کے لیے فارسی کے دو الفاظ کو جو اردو میں مستعمل ہیں، جمع کریں گے تو مفہوم ذہن نشین ہو جائے گا۔ وہ الفاظ ہیں ”بندگی“ اور ”پرستش“۔ بندگی غلامی کو کہتے ہیں۔ اس میں اطاعت کا پہلو غالب ہے جبکہ پرستش کے معنی ہیں مخلصانہ اور والہانہ محبت۔ سورۃ الزمر میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ﴾ (پس (اے نبی!) اللہ کی بندگی کیجیے اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے)۔ پھر سورۃ البیئہ میں ان دونوں کو نہایت حسین و جمیل اسلوب بیان میں بایں طور جمع کر دیا گیا: ﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ﴾ (آیت ۵) ”اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین (اطاعت) کو اس (اللہ تعالیٰ) کے لیے خالص کرتے ہوئے، بالکل یکسو ہو کر۔“ قرآن مجید میں جن و انس کی تخلیق کی غایت یہی عبادت رب قرار دی گئی ہے، از روئے آیت مبارکہ: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریت) ”میں نے جنوں اور انسانوں کو فقط اپنی بندگی کے لیے تخلیق کیا ہے۔“

فرائض دینی کی اس پہلی منزل کو سر کرنے کے لیے ایک بندہ مؤمن کو سہ گونہ (۱) جہاد کرنا پڑے گا، یعنی مجاہدہ و کشمکش کرنی پڑے گی۔

### پہلی منزل کے تین جہاد

اس پہلی منزل پر سب سے پہلے کشمکش کرنی پڑے گی اپنے نفس سے۔ نفس کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے: ﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ﴾ (یوسف: ۵۳) ”یقیناً نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے۔“ ”أَمَّارَةٌ“ امر سے مبالغہ کا صیغہ ہے، یعنی بہت ہی زیادہ اکسانے والا، نہایت سختی سے حکم دینے والا۔ لہذا اللہ کا بندہ بننے کے لیے پہلی کشمکش خود اپنے نفس کے ساتھ کرنی پڑے گی۔ ایک حدیث میں نفس کے خلاف جہاد کو ایک اعتبار سے ”افضل الجہاد“ قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد

فرمایا: ((أَفْضَلُ الْجِهَادِ أَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِي ذَاتِ اللَّهِ تَعَالَى))<sup>(۱)</sup> افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو اللہ کا مطیع بنانے کے لیے ان کے خلاف جہاد کرو؛ حضرت فضالہ بن عبید اللہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ((الْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ))<sup>(۲)</sup> اصل مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے۔ پس پہلی کشمکش ہر اُس شخص کو اپنے نفس سے کرنا ہوگی جو واقعاً اللہ کا بندہ بننا چاہتا ہے۔ اسی نفس کے متعلق مولانا رومؒ نے کیا خوب بات کہی ہے:

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست

لیکن اُو را عونِ ایں را عون نیست!

یعنی میرا یہ نفس بھی فرعون سے کم نہیں ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ فرعون کے پاس لاؤ لشکر تھا لیکن اس کے پاس لاؤ لشکر نہیں ہے؛ ورنہ میرا نفس اندر سے وہی کچھ دعویٰ کر رہا ہے جو فرعون نے کیا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا ملکِ مصر کے بارے میں: «الْيَسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ» (الزخرف: ۵۱) ”کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں ہے؟“ اسی طرح میرا نفس میرے وجود پر حکومت کا دعوے دار ہے۔ پس سب سے پہلا اور سب سے بڑا جہاد ”مجاہدہ مع النفس“ ہے۔ جس نے اس منزل کو سر نہیں کیا اور وہ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے تو میرے نزدیک اس کے لیے ہلکے سے ہلکا لفظ ”حماقت“ ہے۔

نفسِ امارہ کو تقویت دینے کے لیے ایک طاقت موجود ہے، وہ ہے شیطانِ لعین اور اس کی صلبی و معنوی ذریت۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اس نفس کو تقویت پہنچائے، اس میں پھونکیں مارے اور اس میں جتنے بھی سفلی محرکات<sup>(۳)</sup> ہیں انہیں مشتعل کرے۔ ایک حدیث کی ابتدا میں الفاظ آتے ہیں:

(( إِنَّ إِبْلِيسَ لَهُ خُرْطُومٌ كَخُرْطُومِ الْكَلْبِ وَاضَعُهُ عَلَى قَلْبِ ابْنِ آدَمَ يُدَكِّرُ الشَّهَوَاتِ وَاللَّذَّاتِ وَيَكْتِيهِ بِالْأَمَانِيِّ وَيَكْتِيهِ بِالْوَسْوَاسَةِ عَلَى قَلْبِهِ

(۱) رواہ الدیلمی، بحوالہ کنز العمال ۲۶۹/۴۔ (۲) سنن الترمذی، ابواب فضائل الجہاد۔

(۳) گھٹیا کاموں پر اکسانے والے



لَيْشَكَّكَ فِي رَبِّهِ)) (۱)

”ایلیس کی بھی تھو تھنی ہے کتے کی تھو تھنی کی طرح۔ وہ اسے ابن آدم کے دل پر رکھ دیتا ہے اور اسے خواہشاتِ نفس اور مرغوب چیزوں پر ابھارتا ہے وہ اس کو لمبی امیدیں (wishful thinking) دلاتا اور اس کے دل میں وسوسے پیدا کرتا ہے تاکہ اسے اپنے رب کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کر دے۔“

ایک اور متفق علیہ حدیث ہے:

((إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ الْإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ)) (۲)

”شیطان انسان کے اندر خون کی مانند دوڑتا ہے۔“

قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے بے شمار مقامات پر شیطان کے اغوا (۳) اور فریب سے خبردار اور متنبہ کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا: ﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا﴾ (فاطر: ۶) ”(لوگو!) یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے پس تم بھی اسے دشمن سمجھو (دشمن جانو)۔“ اور سورۃ الکہف میں بڑا پیارا انداز ہے جس میں ایک لطیف سا طنز بھی موجود ہے۔  
فرمایا:

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ ۖ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ ۖ أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۚ﴾

(۱) مسند الفردوس للديلمي بحوالہ جامع الكبير لسيوطي۔ روایت کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں فَإِذَا قَالَ الْعَدُوُّ ((اعُوذُ بِاللَّهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ وَأَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ يَحْضُرُونِ إِنَّ اللَّهَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ)) خَسَسَ الْخَرُطُومَ عَنِ الْقَلْبِ۔ جب انسان یہ دعا پڑھتا ہے (ترجمہ) ”میں شیطان مردود کے مقابلے میں اللہ کی پناہ پڑھتا ہوں جو سنتا اور جانتا ہے اور میں اس سے بھی پناہ مانگتا ہوں کہ شیاطین میرے پاس بھی آئیں بے شک اللہ ہی سننے والا اور جاننے والا ہے، تو شیطان اپنی تھو تھنی پیچھے ہٹا لیتا ہے۔“

(۲) صحیح البخاری، کتاب الاعتکاف، باب زیارة المرأة زوجها في اعتكافه۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری میں یہ حدیث متعدد مقامات پر الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ متعدد طرق سے وارد ہوئی ہے۔ و صحیح مسلم، کتاب السلام، باب بیان انه يستحب لمن رؤى خاليا بامرأة وكانت زوجته او محرما له ان يقول: هذه فلانة، ليدفع ظن السوء به۔ و سنن ابی داؤد، کتاب الصیام، باب المعتکف یدخل البیت لحاجته۔

(۳) بہکانہ

بُئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا ﴿٥٥﴾

”اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ وہ جنوں میں سے تھا، سو اُس نے اپنے رب کے حکم سے روگردانی کی۔ کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی ذریت (صلبی و معنوی) کو اپنا دوست بناتے ہو؟ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔ ایسے ظالموں کے لیے بہت ہی برا بدلہ ہے۔“

چنانچہ کشمکش کرنا ہوگی، مجاہدہ کرنا ہوگا شیطان اور اس کی صلبی و معنوی ذریت کے ساتھ اور اس کو شکست دینا ہوگی۔ اس لفظ ”شکست“ سے میرا ذہن اچانک علامہ اقبال کے فارسی کلام میں اُن کی نظم ”نالہ ابلیس“ کی طرف منتقل ہوا جو مجھے بہت پسند ہے۔ شیطان اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتا ہے کہ پروردگار! یہ انسان تو میری چوٹ کا نہیں، میرے مقابلے کا نہیں، ایک مشیتِ خس<sup>(۱)</sup> ہے جس کے لیے میری ایک چنگاری کافی ہے۔ اس انسان کو اگر سوکھی گھاس ہی بنانا تھا تو مجھ میں اس قدر تیز و تند آگ رکھنے کا کیا فائدہ ہوا!

ابن آدم چیست؟ یک مشیتِ خس است! مشیتِ خس را یک شرار از من بس است  
اندریں عالم اگر جز خس نبود این قدر آتش مرا دادن چه سود؟  
نظم کا آخری شعر تڑپا دینے والا ہے۔

اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست لذتے شاید کہ یابم در شکست!  
”الہی! کوئی تو زندہ مردِ حق پرست ایسا ہو جو مجھے شکست دے دے تاکہ میں بھی تو کبھی شکست کا لذت آشنا ہو سکوں۔“

تو دوسری کشمکش اور دوسرا مجاہدہ یہ ہوگا۔

تیسری کشمکش ایک بگڑے ہوئے معاشرے کا جو سماجی دباؤ (social pressure) ہے اس سے ہوگی۔ معاشرے کا دباؤ آپ کو ایک خاص رُخ پر دھکیلیے گا۔ اس لیے کہ ایک ہجوم جس سمت میں جا رہا ہو اُس سمت میں چلنا بہت آسان ہے۔ آپ کو کوئی زور نہیں لگانا پڑے گا، وہ آپ کو خود دھکیل کر لے جائے گا۔ ع

(۱) مٹھی بھر خشک گھاس

”زمانہ با تو نسا زد تو با زمانہ بساز!“

”زمانہ تمہارے ساتھ موافقت نہیں کرتا تو تم اس کے ساتھ موافقت کرلو!“

اس طرح کوئی تصادم نہیں ہوگا، کوئی کشمکش نہیں ہوگی، کوئی مزاحمت نہیں ہوگی۔ دُنیوی نقطہ نظر سے عافیت اسی میں ہے، چین اور سکون سے زندگی بسر ہوگی کہ زمانہ تم سے موافقت نہیں کر رہا تو تم زمانے کے ساتھ موافقت کرلو۔ لیکن غیرت و حمیت کا تقاضا بالکل برعکس ہے ع

”زمانہ با تو نسا زد تو با زمانہ ستیز!“

”زمانہ تم سے موافقت نہیں کرتا تو تم اس سے لڑو!“

پس دینی فرائض کی پہلی منزل پر تین اطراف و جوانب میں یہ تین کشمکشیں ہیں جو ہر اُس شخص کو کرنی ہوں گی جو واقعۃً اللہ کا بندہ بننے کا ارادہ اور عزم رکھتا ہو۔

### دوسری منزل: شہادت علی الناس

فرائض دینی کی دوسری منزل ہے اس دین کو عام کرنا، دوسروں تک پہنچانا، اسے پھیلانا۔ اس کے لیے چار اصطلاحات اہم ہیں۔ پہلی دو اصطلاحات ہیں: ”تبلیغ“ اور ”دعوت“۔ یہ بھی اطاعت و تقویٰ کی طرح تصویر کے دو رخ اور مثبت و منفی مفہوم کے حامل الفاظ ہیں۔ تبلیغ سے مراد پہنچانا اور دعوت سے مراد لوگوں کو کھینچ کر راہ حق پر لے آنا ہے۔ یہ بھی ایک ہی عمل کے دو رخ ہیں۔ تبلیغ کے لیے نبی اکرم ﷺ کو یہ تاکید دی حکم ہوا:

﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۚ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ

رِسَالَتَهُ ۚ﴾ (المائدة: ۶۷)

”اے رسول (ﷺ)! پہنچائیے جو آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے

نازل ہوا ہے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو (گویا) اپنی رسالت کا حق ادا نہ کیا۔“

نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں اُمت کو جو آخری تاکید کی حکم دیا وہ اسی تبلیغ کا تھا۔

فرمایا: ((فَلْيَبْلِغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ))<sup>(۱)</sup> ”پس جو موجود ہے (مخاطب ہے) اسے چاہیے

کہ (یہ پیغام) اس کو پہنچائے جو یہاں موجود نہیں ہے!“ مزید برآں آنحضور ﷺ نے یہ

فرما کر ہر مسلمان کے لیے فریضہ تبلیغ آسان ترین فرمادیا: ((يَلْعَوُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً))<sup>(۲)</sup>

(۱) صحیح بخاری کتاب الحج باب الخطبة ایام منی (۲) حاشیہ اگلے صفحہ پر

”میری طرف سے پہنچاؤ چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو“۔ دعوت کے لیے نبی اکرم ﷺ کو تاکید کی حکم ہوا:

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ط﴾ (النحل: ۱۲۵)

”(اے نبی!) اپنے رب کے راستے کی طرف بلائے حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان (کفار و مشرکین) کے ساتھ مجادلہ کیجیے احسن طریقے سے۔“ یہ بڑی مہتمم بالشان آیت ہے اس پر میں بعد میں کچھ عرض کروں گا۔ یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ اس آیت میں دعوت کی تین سطحیں (levels) بیان ہوئی ہیں۔

دعوت کے ضمن میں ایک مزید اہل اور رہنما اصول اس آیت مبارکہ میں بیان کر دیا گیا: ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ (حم السجدة)

”اور اُس سے بڑھ کر اچھی بات کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے یقیناً میں خود بھی فرمانبرداروں (مسلمانوں) میں سے ہوں!“ یعنی دعوت اللہ کی طرف ہو، اُس کے ساتھ ہی داعی کی سیرت و کردار عمل صالح کا مظہر ہو۔ مزید برآں وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھے، مسلمان کہلائے۔ اس کی دعوت کسی فقہی مسلک کی طرف نہ ہو اور نہ ہی اس کا لیبل چسپاں ہو۔ جو شخص اللہ کی طرف دعوت دے اس سے بہتر بات اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔

اسی دوسری منزل کے لیے دو اصطلاحات مزید ہیں جو بڑی اہم ہیں، لیکن ان کا ادراک و شعور قریباً معدوم کے درجے میں آ گیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں، ”الّا ماشاء اللہ“، چند ہی لوگ ہوں گے جو ان کی اہمیت کو سمجھتے ہوں گے اور ان پر عمل کرتے ہوں گے۔ ان میں تیسری اصطلاح ہے: ”امر بالمعروف و نہی عن المنکر“، یعنی نیکیوں کا پرچار، اُن کی تلقین، اُن کا حکم اور برائیوں سے بدی سے لوگوں کو روکنا، بدی اور برائی کے راستہ میں آڑے آنا۔ ہماری ایک دینی تحریک میں امر بالمعروف پر ایک درجہ میں عمل بھی ہو رہا ہے تو اس میں نبی

عن المنکر سے صرف نظر ہے۔ حالانکہ حدیث شریف میں نبی عن المنکر پر زیادہ زور اور تاکید ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(( مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فِلِسَانِهِ ، فَإِنْ لَمْ

يَسْتَطِعْ فِقَلْبِهِ ، وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ )) <sup>(۱)</sup>

”(اے مسلمانو! تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ (یعنی طاقت) سے روکے، اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے (یعنی نصیحت و تلقین کرے) اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو (کم از کم) دل میں اسے برا جانے (اس پر کڑھے اور پیچ و تاب کھائے) اور یہ کمزور ترین ایمان (کی نشانی) ہے۔“

ہمارے اس دور کے لحاظ سے مسلم شریف کی ایک اور حدیث بہت اہم اور قابل التفات ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللَّهُ فِي أُمَّةٍ قَبْلِي إِلَّا كَانَ لَهُ فِي أُمَّتِهِ حَوَارِيُونَ وَأَصْحَابٌ يَأْخُذُونَ بِسُنَّتِهِ وَيَقْتُلُونَ بِأَمْرِهِ ، ثُمَّ إِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوفٌ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ وَيَفْعَلُونَ مَا لَا يُؤْمَرُونَ ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ، وَلَيْسَ وَرَاءَ ذَلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ )) <sup>(۲)</sup>

”مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا، اس کی امت میں اس کے ایسے حواری اور ساتھی ہوا کرتے تھے جو اس نبی کی سنت پر عمل کرتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر اُن حواریین کے بعد ایسے نالائق جانشین آ جاتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور ایسے کام کیا کرتے تھے جن کا انہیں (اللہ کی طرف سے) حکم نہیں ہوا کرتا تھا۔ تو ایسے لوگوں سے جو ہاتھ سے جہاد کرے تو وہ

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان

(۲) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان

مؤمن ہے اور جو زبان سے جہاد کرے تو وہ بھی مؤمن ہے اور جو دل سے جہاد کرے تو وہ بھی مؤمن ہے اور اس کے ورے تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔“

یہ ہے ہمارے دین میں نبی عن المنکر کی اہمیت۔

اس دوسری منزل کے لیے چوتھی جامع ترین اصطلاح ہے ”شہادت علی الناس“۔ جیسے پہلی منزل کے لیے جامع ترین اصطلاح میں نے ”عبادت“ بیان کی تھی دوسری منزل کے لیے ”شہادت علی الناس“ جامع ترین اصطلاح ہے۔ جناب محمد ﷺ آخری نبی اور آخری رسول ہیں۔ لہذا آپ کی امت بھی آخری امت ہے۔ یہ امت اس لیے برپا کی گئی ہے کہ قیام قیامت نوع انسانی پر اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت دے۔ ارشاد الہی ہے:

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ (البقرة: ۱۴۳)

”اور اس طرح (اے مسلمانو!) ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا ہے تاکہ تم نوع انسانی پر گواہ ہو جاؤ اور رسول تم پر گواہ ہو جائیں۔“

سورۃ الحج کی آخری آیت اس موضوع پر بڑی عظیم آیت ہے۔ فرمایا:

﴿وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۖ هُوَ اجْتَبَاكُمْ﴾

”اور جہاد کرو اللہ کیلئے جیسا کہ (اور جتنا کہ) اس کیلئے جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے (پسند کر لیا ہے) ایک خاص مقصد کیلئے تمہارا انتخاب ہو گیا ہے۔“

درمیان میں ایک جملہ معترضہ ہے:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۖ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۖ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا﴾

اس کے بعد امت کے اجتباء (چن لیے جانے) کا مقصد بایں الفاظ بیان ہوا:

﴿لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾

”تاکہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم پوری نوع انسانی کے لیے گواہ بن جاؤ۔“

یعنی لوگوں پر اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت دے کر حجت قائم کرو تاکہ قیامت کے دن

عدالتِ خداوندی میں گواہی دے سکو testify کر سکو کہ پروردگار! ہم نے تیرا دین ان تک پہنچا دیا تھا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت میں پہلے اُمت کا ذکر ہوا اور پھر رسولؐ کا، لیکن یہاں پہلے رسولؐ اور پھر اُمت کا ذکر ہے۔

شہادت علی الناس وہ اصطلاح ہے کہ یہاں آ کر اُمتِ محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تعلق کا رسالت سے جڑ جاتا ہے۔ چونکہ آنحضور ﷺ آخری نبی اور آخری رسول ہیں لہذا یہ آپؐ کی ذمہ داری ہے کہ دعوت و تبلیغ کے ذریعے اور اپنے قول و عمل کی ہم آہنگی کی شہادت کے ذریعے ”دین الحق“ کو بالفعل قائم کر کے اس کی برکات کے ذریعے لوگوں پر حجت قائم کریں۔ اس شہادت کی اہمیت کا اندازہ سورۃ النساء کی اس آیت سے لگائیے، فرمایا:

﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾ (النساء)

”اس دن کیا حال ہوگا جس دن ہم ہر اُمت پر ایک گواہ کھڑا کریں گے اور (اے نبی!) ان سب پر آپؐ کو گواہ بنا کر لائیں گے!“

عدالتِ خداوندی میں رسولؐ دراصل استغاثہ<sup>(۱)</sup> کے گواہ ہوں گے وہ کہیں گے اے پروردگار! میں نے تیرا پیغام اپنے قول و عمل سے شہادت دیتے ہوئے بنی نوع انسان تک پہنچا کر ان پر حجت قائم کر دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد شہادت علی الناس کی یہ ذمہ داری اُمت کے کاندھوں پر ہے۔

شہادت علی الناس کی ذمہ داری کی نزاکت کو سمجھ لیجئے۔ اگر بالفرض رسول اللہ تعالیٰ کا پیغام نہ پہنچاتے تو اللہ کے یہاں وہ مسئول ہوتے۔ انہوں نے پہنچا دیا تو وہ بری ہو گئے۔ اب لوگ جواب دہ ہوں گے۔<sup>(۲)</sup> نبی اکرم ﷺ نے جتہ الوداع کے موقع پر سوالا لاکھ کے مجمع سے گواہی لے لی: أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ اور پورے مجمع نے بیک زبان ہو کر گواہی دی: قَدْ

(۱) دعویٰ (۲) یہی بات سورۃ الاعراف میں اس اسلوب سے بیان فرمائی گئی: ﴿فَلَنَسْتَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْتَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ﴾ ”پس یہ لازماً ہو کر رہنا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور رسولوں سے بھی پوچھیں (کہ انہوں نے ہمارا پیغام پہنچا دیا تھا یا نہیں اور ان کو کیا جواب ملا)۔“ (شیخ جمیل الرحمن)

بَلَّغَتْ وَأَذَيْتَ وَنَصَحْتَ۔ تین بار یہ سوال و جواب ہوئے۔ اس کے بعد حضورؐ نے آسمان کی طرف، پھر مجمع کی طرف اپنی انگشتِ مبارک سے اشارہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا: اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ<sup>(۱)</sup> اُمّت کا اجْتِبَاء<sup>(۲)</sup> جہاں بہت بڑا اعزاز ہے وہاں بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ اگر اُمّت نے اس شہادت علی الناس کا فریضہ انجام نہیں دیا تو بنی نوع انسان کی گمراہی کے وبال سے عدالتِ خداوندی میں پچنا محال ہو جائے گا اور نبی اکرم ﷺ کی گواہی ہمارے خلاف ہو جائے گی۔

### دعوت و تبلیغ کی تین سطحیں

اس تبلیغ و دعوت کی بھی تین سطحیں ہیں جن کو سمجھنا ضروری ہے ورنہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس مغالطہ میں مبتلا رہیں کہ ہم تو تبلیغ کا حق ادا کر رہے ہیں، درآں حالیکہ وہ صورتِ تبلیغ ہو، حقیقی تبلیغ نہ ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ الحمد للہ اس دور میں ایک خاص سطح پر تبلیغ و دعوت کے لیے ایک بہت وسیع حرکت ہو چکی ہے۔ اس کے حجم کا جہاں تک تعلق ہے وہ بڑا متاثر کن ہے اور ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد اس گلوب<sup>(۳)</sup> پر ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں۔ لیکن میں پوری ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ تبلیغ اور دعوت کے لیے اگر ہم نے قرآنی ہدایات کو اپنا امام نہ بنایا اور ان کے مطابق کام نہ کیا جاسکا تو مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہوں گے۔ اس ضمن میں وہی دو آیات دوبارہ ملاحظہ کیجیے جو میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔ پہلی آیت ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ بَلِّغُوا مَّا أُنْزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ ۖ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَمَا بَلَّغْتُمْ

رِسَالَتَهُ ۖ﴾ (المائدہ: ۶۷)

اس آیت مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کو جس تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے وہ قرآن مجید ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿بَلِّغُوا مَّا أُنْزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ ۖ﴾ یعنی ”تبلیغ کیجیے اس کی (یعنی قرآن کی) جو آپ پر اتارا گیا ہے آپ کے رب کی جانب سے“۔ پس تبلیغ کا اصل محور و مرکز قرآن مجید ہونا چاہیے۔ پھر حضور ﷺ کے ارشاد مبارک نے ہر مسلمان کے لیے قرآن حکیم کی تبلیغ کے کام کو آسان بنا دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ((بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً)) ”پہنچاؤ میری جانب سے



چاہے ایک ہی آیت پہنچاؤ۔“ یہاں ”عَنْی“ کا لفظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ یہ لفظ یہاں جس معنی و مفہوم کا حامل ہے اسے انگریزی میں ادا کیا جائے تو وہ ہوگا "on my behalf"۔ قرآن مجید کی تبلیغ کی اصلاً ذمہ داری ہے نبی اکرم ﷺ کی۔ چنانچہ اسی آیت مبارکہ کے اگلے حصہ میں فرمایا: ﴿وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ﴾ ”اور اگر آپ (ﷺ) نے بالفرض یہ کام نہیں کیا تو آپ نے تبلیغ رسالت کا حق ادا نہ کیا۔“ میں نے ترجمہ میں لفظ ”بالفرض“ کا اضافہ اس لیے کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق ذرا سایہ گمان کہ آپ قرآن حکیم کی تبلیغ میں کوتاہی فرمائیں گے ایمان کے منافی ہو جائے گا۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ یہ اسلوب بیان درحقیقت امت کے انتباہ (warning) کے لیے اختیار فرمایا گیا ہے کہ کہیں وہ اس ذمہ داری سے غافل نہ ہو جائے جو پوری امت پر بحیثیت کل اور ہر مسلمان پر بحیثیت امتی رسول عائد ہوتی ہے۔

دوسری آیت جس کی تفصیل میں نے مؤخر کر دی تھی اس کے حوالے سے دعوت کی تین سطحوں کا سمجھنا ضروری ہے۔ آیت مبارکہ ہے:

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ (النحل: ۱۲۵)

”(اے نبی) دعوت دواپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت و دانائی کے ساتھ اور عمدہ وعظ و نصیحت کے ساتھ اور (ہٹ دھرم ضدی اور ججی) لوگوں کے ساتھ مجادلہ کرو اس طریق پر جو بہت ہی عمدہ ہو۔“

ہر دور اور ہر معاشرے میں آپ کو لوگوں کی تین سطحیں ملیں گی۔ ایک سب سے بلند سطح کے لوگ ہوتے ہیں، یعنی ذہین اقلیت (intellectual minority)۔ اسی کو intelligentsia بھی کہتے ہیں۔ یہی brain trust کہلاتا ہے۔ یہ طبقہ اگرچہ قلیل ترین اقلیت میں ہوتا ہے لیکن معاشرے میں مؤثر ترین ہوتا ہے اور معاشرے کا رخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جیسے انسان کے جسم میں دماغ ہے جو وزن کے لحاظ سے کم و بیش آدھ سیر کا ہوگا، لیکن یہ اس کے پورے وجود اور پورے تن و توش کو کنٹرول کرتا

ہے۔ ہاتھ پکڑ سکتا ہے، لیکن کس شے کو پکڑے، کس کو نہ پکڑے، اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا، اس کا فیصلہ دماغ کرتا ہے۔ ٹانگیں اسے لے کر چل سکتی ہیں، لیکن کس سمت میں چلیں، کس میں نہ چلیں، اس کا فیصلہ دماغ کرتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کا رُخ درحقیقت یہی ذہن اقلیت متعین کرتی ہے۔ اس کو جب تک دعوت دینے کا تقاضا دلیل کے ساتھ، برہان کے ساتھ پورا نہیں کیا جائے گا، یہ طبقہ کوئی اثر قبول نہیں کرے گا۔ جیسے قرآن حکیم یہود کو کھلا چیلنج کرتا ہے:

﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ (البقرة)

”(اے نبی! ان سے) کہہ دو کہ اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔“

اگر اس ذہن اقلیت کو اعلیٰ علمی و فکری سطح پر مدلل طور پر آپ دین کی دعوت پیش نہیں کریں گے اور اسے by pass کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ ذہن اقلیت دین کے حق میں ہموار نہ ہو سکی۔ اگرچہ by pass دل کے آپریشن میں بہت مفید ہوتا ہے، لیکن اسلامی انقلابی عمل میں یہ طرز عمل بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اگر عوامی سطح پر بات پھیلتی چلی جا رہی ہے لیکن ذہن اقلیت میں وہ بار نہیں پار رہی تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا، اجتماعی سطح پر کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ لہذا یہاں ہدایت آئی: ﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ﴾ ”اے نبی! (لوگوں کو) حکمت کے ساتھ اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دیجیے۔“ اس حکمت کے ساتھ جس کے متعلق ایک مقام پر فرمایا: ﴿وَمَنْ يُؤْتَ الْحُكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ (البقرة: ۲۶۹) ”اور جس کو حکمت ودانائی ملی، اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی (بہت خیر مل گیا)۔“ مجھے بڑا افسوس ہے کہ بعض لوگوں نے یہاں ”حکمت“ کو حکمتِ عملی کے معنی میں لے کر اس آیت مبارکہ کی بڑی حق تلفی کی ہے۔ حکمتِ عملی بالکل دوسری چیز ہے، اگرچہ وہ بھی یقیناً مطلوب شے ہے، لیکن یہاں جس شان کے ساتھ یہ لفظ آیا ہے، درحقیقت اس کا مفہوم حکمتِ عملی نہیں ہے، بلکہ دلائل و براہین کے ساتھ دانائی کے ساتھ اس دعوت کو پیش کرنا ہے۔ اگر سوسائٹی کی ذہن اقلیت کو اس وقت اور اس دور کی اعلیٰ علمی و فکری سطح پر دعوت پیش نہ کی جاسکے تو معاشرہ بحیثیت مجموعی کبھی متاثر نہیں ہو سکتا۔

دعوت کی دوسری سطح ”عوامی“ ہے۔ عوام کو دعوتِ عمدہ و عظم اور دل نشین نصیحت کے

ذریعے دی جائے گی، کیونکہ انہیں کسی دلیل اور حجت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے لیے ضرورت ہے موعظہ حسنہ کی، وہی ان کے لیے کفایت کرے گی۔

اس سطح پر یہ بات نہایت اہم ہے کہ سننے والے یہ محسوس کریں کہ جو وعظ کر رہا ہے وہ ہم پر اپنی دین داری، علمیت اور شخصیت کی دھونس نہیں جمانا چاہتا، بلکہ وہ مخلص ہے اور ہماری خیر خواہی کے لیے بات کہہ رہا ہے۔ اسے کسی دُنیوی اجر اور صلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ساتھ ہی انہیں یہ اعتماد ہو کہ وہ بہروپیا نہیں ہے ﴿اتَمَرُوا النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنَسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ﴾ (البقرة: 44) والا معاملہ نہیں ہے، بلکہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے اپنی ذاتی اور نجی زندگی میں اس پر خود بھی عمل پیرا ہے۔ یہ دو چیزیں جمع ہو جائیں، ایک موعظہ حسنہ اور دوسرے واعظ کا اعلیٰ کردار تو معاملہ ہوگا: از دل خیر در دل ریز، ذورع

”دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے!“

یہ ہے عوامی سطح پر دعوت و تبلیغ۔ میں جانتا ہوں کہ اس دور میں اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کے ایک بڑے طبقے میں عام طور پر وعظ کو ایک گالی کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ بڑے ہی استحقار<sup>(۱)</sup> کے انداز میں کہا جاتا ہے ”اجی وعظ کہہ رہے ہیں“۔ حالانکہ وعظ بڑی عظیم اور موثر شے ہے اور قرآنی اصطلاح ہے، لیکن اس کا ایک مقام اور محل ہے جہاں یہ تاثر دیکھاتا ہے۔ یہ عمل غیر موقع اور بے محل ہوگا تو غیر موثر رہے گا۔ ظلم کا مطلب ہی یہ ہے: وَضَعُ الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَحَلِّهِ۔ یعنی ”کسی چیز کو اپنے اصل مقام کی بجائے کسی اور جگہ رکھنا“۔ ان عوام کو آپ فلسفہ پڑھائیں گے تو حماقت ہوگی اور intellectuals کو آپ وعظ پلائیں گے تو یہ کام بھی غیر معقول ہوگا۔ ہر شے کو اپنی جگہ پر رکھنا ہی عدل ہے۔

تیسری سطح جو ہر معاشرے میں موجود ہوتی ہے وہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو ہٹ دھرم ہوتے ہیں، جو کبھی مان کر نہیں دیتے، جن کے اپنے مفادات ہوتے ہیں، جن کی امداد باہمی کی انجمنیں بنی ہوتی ہیں، جن کے مفادات باطل نظام سے وابستہ ہوتے ہیں اور وہ اپنے مفادات کی وجہ سے کورچشم<sup>(۲)</sup> ہو چکے ہوتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات علیٰ وجہ البصیرت

لوگوں کو گمراہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے زہر کا تریاق فراہم نہ کیا جائے تو یہ عوام الناس کو گمراہ کرتے چلے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں مناظرہ کا فن وجود میں آیا پھر اس نے باقاعدہ ایک خاص تکنیک اور تخصص (Specialization) کی شکل اختیار کی۔ موجودہ دور میں کچھ لوگوں نے اسے پیشہ ہی بنالیا تو اس میں چند خرابیاں درآئیں۔ مثلاً مجمع عام ہے، دادل رہی ہے، تحسین ہو رہی ہے، تالیاں بج رہی ہیں، نعرے لگ رہے ہیں۔ گویا اتنی بڑی جیوری (Jury) ہے جس کے سامنے دو پہلوان عقلی کشتی لڑ رہے ہیں۔ یہ مناظرہ اور مجادلہ کا احسن انداز نہیں۔ قرآن مجید جسے مجادلہ کہتا ہے وہ احسن طریق پر محکم دلائل اور برہان کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔

دعوت کی یہ تیسری سطح لازمی ہے۔ اگر یہ کام آپ نہیں کریں گے تو اغیار سے شکست کھا جائیں گے۔ کون نہیں جانتا کہ ہمارے معاشرے میں عیسائیت کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ ہم کنویں کے مینڈک کی طرح ایک ہی دائرے میں چکر لگاتے رہے اور فقہی تعبیرات رائج و مرجوح، افضل و مفضل کے رد و قبول میں آپس میں ہی مناظرے اور دنگل جھماتے رہے اور جمارہے ہیں، جبکہ اندر ہی اندر عیسائیت دیمک کی طرح ہمارے معاشرے کو کھاتی چلی جا رہی ہے۔ اسی طرح دعوتی سطح پر اس دور میں قادیانیت بہت فعال ہو گئی ہے<sup>(۱)</sup>۔ قادیانی مبلغین کا انداز بڑا جارحانہ ہوتا ہے اور ایک عام آدمی تو کجا اچھا بھلا پڑھا لکھا، بلکہ عالم دین بھی ان کے مناظرین و مبلغین کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ الا ماشاء اللہ۔ ان قادیانی مناظرین و مبلغین کو جس طرح خاص موضوعات پر تربیت دی گئی ہے، اس کے رد اور ابطال<sup>(۲)</sup> کے لیے جب تک ہمارے ذہین و فطین لوگوں کو اسی طرح ٹریننگ نہ ملے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔ ایک وقت میں جب یہاں انگریزی حکومت کی سرپرستی میں بڑے زور و شور کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ شروع ہوئی تھی اور پادری فینڈر نے برصغیر میں تہلکہ مچا دیا تھا، اگر اُس وقت وہ مردِ حق کھڑا نہ ہو گیا ہوتا جس کا نام نامی مولانا رحمت اللہ کیرانوی ہے، رحمۃ اللہ علیہ، تو آپ اندازہ

(۱) یہ تقریر قادیانیوں کے بارے میں صدارتی آرڈیننس سے قبل کی ہے۔ (مرتب)

(۲) جھوٹا اور باطل ثابت کرنا

نہیں کر سکتے کہ ہندوستان میں مسلمان کس طرح عیسائیت کے اس سیلاب کی نذر ہو جاتے۔ اس پادری فینڈر نے پورے ہندوستان کے علماء کو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر لکارا اور کھلے طور پر دعوتِ مبارزت<sup>(۱)</sup> دی۔ مولانا کیرانویؒ ٹھونک کر میدان میں آئے اور پادری فینڈر کو میدان چھوڑ کر ہندوستان سے بھاگنا پڑا۔ پھر وہ ترکی پہنچا اور وہاں بھی اس نے یہی ہتھکنڈے شروع کیے۔ عثمانی سلطنت نے مولانا کیرانویؒ کو ترکی آنے کی دعوت دی۔ مولانا جب وہاں پہنچے تو پادری فینڈر وہاں سے بھی فرار ہو گیا۔ تو دعوت کی یہ بھی ایک سطح ہے۔ یہ تیسری سطح ہے۔ کچھ لوگ اس کا تحقیق کے انداز میں ذکر کرتے ہیں، حالانکہ یہ بھی کرنے کا کام ہے۔ البتہ واضح رہے کہ قرآن اس کے لیے ہمیں ایک امتیازی اخلاقی معیار قائم رکھنے کا حکم دے رہا ہے: ﴿جَادِلْهُمْ بِلَّتِي هِيَ اَحْسَنُ﴾۔ یعنی اس مجادلے میں بھی بالکل مخالفین کی سطح پر نہ اتر آؤ، بلکہ تمہارا دایمانہ کردار اور اس کی ایک اخلاقی شان ضرور برقرار رہنی چاہیے۔

ظاہر بات ہے کہ ایک شخص ان تینوں سطحوں پر کام نہیں کر سکتا۔ ہر کام کے اپنے اپنے تقاضے ہیں۔ جو سب سے اونچا کام ہے اس کے لیے اس دور میں ”علم کو مسلمان بنانے“ کی ضرورت ہے۔ آج علم ملحد ہو چکا ہے۔ اس کے بارے میں بڑی پیاری بات علامہ اقبال نے کہی ہے۔

عشق کی تیغ جگر دار<sup>(۲)</sup> اڑالی کس نے؟

علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

معرفتِ خداوندی کی تلوار اس علم کی نیام میں سے نکل گئی ہے۔ یہ نرا خول ہے، اور محض خالی نہیں ہے، بلکہ اس میں الحاد کا خنجر اس تلوار کی جگہ پیوست کر دیا گیا ہے۔ اس علم کو مسلمان بنانا آسان نہیں ہے۔ لوگ نظامِ تعلیم کی بات کیا کرتے ہیں۔ میں یہ کہا کرتا ہوں کہ نظام اتنی بڑی بات نہیں ہے، یہ تو تعلیم دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی علم کہاں ہے جسے پہنچایا جائے؟ محض دینیات کا ایک پیرٹیا اسلامیات کا ایک شعبہ قائم کرنے سے کام

نہیں چلے گا، جبکہ طبعیات، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات اور جو دوسرے علوم ایک طالب علم حاصل کر رہا ہے ان کے رگ و پے میں الحاد اور مادہ پرستی سرایت کیے ہوئے ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا  
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ!

توحید کی بنیاد پر جب تک پورے علم کی تدوین نو<sup>(۱)</sup> نہیں ہوگی، تمام علوم کو جب تک مسلمان نہیں بنایا جائے گا، ہماری نئی نسل کے اذہان کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا ممکن نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ آسان کام نہیں ہے۔ جب تک سینکڑوں اور ہزاروں اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ))<sup>(۲)</sup> کو اپنا اصول عمل (Motto) بنا کر میدان میں نہیں آئیں گے اور ان کو اداروں اور حکومت کی جانب سے مناسب ذرائع مہیا نہیں کیے جائیں گے اُس وقت تک یہ کام کیسے ہوگا! ہاں وعظ کی سطح پر ہمیں زیادہ جوہر قابل (Talent) مل سکتا ہے۔ رہا مجادلہ کی سطح پر افراد کی ضرورت تو اس کے لیے خصوصی تربیت گاہوں کی ضرورت ہے۔

دعوت کی تینوں سطحوں پر کام کرنے کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ باصلاحیت نوجوان جن کے دل میں واقعی دین کا کام کرنے کی تڑپ ہے، ولولہ ہے، اُمنگ اور جذبہ ہے، وہ آگے بڑھیں، ان اعلیٰ و ارفع مقاصد کے لیے اپنا ذنبوی کیریز قربان کریں اور اپنی جانیں ان مقاصد کے حصول میں کھپائیں، تب جا کر ہی یہ کام ہوگا۔ اور یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل۔ دین کی تبلیغ اور دعوت کے لیے مال و جان کو ان تینوں سطحوں پر کھپانا۔

عجب حسن اتفاق ہے کہ میں نے نبی عن المنکر سے متعلق جو دو حدیثیں بیان کی ہیں ان میں نبی عن المنکر کے کام کی انجام دہی کے لیے تین سطحوں ہی کا بیان ہوا ہے۔ پہلی سطح یہ ہے کہ بدی اور برائی کو ہاتھ یعنی قوت و طاقت سے روک دینا۔ دوسری یہ کہ اگر طاقت نہ ہو تو زبان سے، وعظ سے اور تلقین و نصیحت سے اس کو روکنا، اس کی مذمت کرنا۔ اور تیسری سطح یہ

(۱) نئی ترتیب (۲) صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن باب خیر کم من تعلم القرآن وعلمہ

ہے کہ اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل میں اسے برا جاننا، اس پر گھٹن محسوس کرنا، اس پر پیچ و تاب کھانا۔ اور یہ آخری سطح ایمان کے کمزور ترین ہونے کی دلیل ہے۔ دوسری حدیث میں ان تینوں سطحوں کے لیے نبی اکرم ﷺ نے ”جہاد“ کا لفظ استعمال فرمایا۔

اس دوسری منزل کے لیے ایک دوسرا عنوان ”نظریاتی کشمکش“ یا ”فکری تصادم“ ہے۔ اگر آپ توحید کو پھیلانا چاہتے ہیں تو مشرکانہ اوہام رکھنے والے موجود ہیں، ان سے نظریاتی سطح پر تصادم اور مقابلہ ہوگا۔ آپ کو walk over نہیں مل جائے گا۔ کس قدر اہم بات ہے کہ قرآن مجید نے یہی لفظ ”جہاد“ مشرک والدین کے ضمن میں دو جگہ استعمال کیا ہے، ایک سورۃ لقمان میں اور دوسرے سورۃ العنکبوت میں۔ جو نو جوان نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے تھے تو ان کے مشرک والدین ان پر دباؤ ڈالتے تھے کہ وہ واپس اپنے آبائی دین پر آ جائیں۔ سورۃ لقمان میں ارشاد ہے:

﴿وَأَنْ جَاهِدْكَ عَلَىٰ أَنْ تَشْرِكَ بِى مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ﴾

معلوم ہوا کہ مشرک بھی مجاہد تھے۔ وہ مجاہد فی سبیل الشریک اور مجاہد فی سبیل الطاغوت تھے اور نبی اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم بھی مجاہد تھے اور وہ تھے مجاہد فی سبیل اللہ اور مجاہد فی التوحید۔ یہ جہاد اور یہ کشمکش آپ کو ہر دور میں ملے گی اور یہ بات بغیر استثناء کے حقیقت نفس الامری ہے۔

ستیزہ کار<sup>(۱)</sup> رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغِ مصطفویٰ سے شرارِ بولہبی

### تیسری منزل۔ غلبہ و اقامتِ دین

جہاد کی تیسری منزل سب سے کٹھن، سب سے بھاری اور سب سے مشکل ہے۔ اور یہ ہے دین کو غالب کرنے، قائم کرنے اور نافذ کرنے کے لیے اعلیٰ کلمۃ اللہ کے لیے اس مقصد کے لیے کہ دین کا تجزیہ اور اس کے حصے بخرے کیے بغیر وہ کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے، جہاد کرنا۔ جیسے انفرادی سطح پر فرمایا گیا: ﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ

لَهُ الدِّينَ حَقَّاءُ<sup>(۱)</sup> ویسے ہی اجتماعی سطح پر دین کے غلبہ کے لیے جہاد و قتال کا حکم دیا گیا۔ فرمایا: ﴿وَقِيلُوا لَهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً وَيَكُونَ الدِّينُ كَمَلَّةٍ لِلَّهِ﴾<sup>(۲)</sup>۔ یہ ہے جہاد کی بلند ترین چوٹی اور سب سے کٹھن اور مشکل مرحلہ۔ اس کی وجہ بھی اظہر من الشمس<sup>(۳)</sup> ہے۔ پہلی منزل پر ذاتی سطح پر نفس کے ساتھ کشمکش تھی۔ دوسری منزل پر اہل زلیغ کے ساتھ نظریاتی اور فکری سطح پر کشمکش تھی۔ اس تیسری منزل پر طاغوتی نظام کو ہٹانے کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے اس لیے کہ دو نظام کسی حال میں بھی co-exist<sup>(۴)</sup> نہیں کر سکتے۔ پچاس مذاہب بھی ایک بالاتر نظام کے تحت اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ مذاہب باہمی اختلافات کے علی الرغم پُر امن طور پر پہلو بہ پہلو زندگی گزار سکتے ہیں۔ یہ بالکل قابل عمل ہے۔ اس لیے کہ دنیا کا غالب تصور یہی ہے کہ مذہب تو لوگوں کے انفرادی اور نجی مسائل و معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ اجتماعیات کے تمام امور میں مذہب کا عمل دخل اس دور میں تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ یہ سیکولر فیلڈ ہے۔ جیسا کہ انگریز کے دور میں ہندوستان میں اصل نظام اجتماعی (Law of the Land) سرکار انگلشیہ<sup>(۵)</sup> کا تھا۔ ہندوستان میں رہنے والے تمام مذاہب کے لوگوں کو آزادی تھی کہ وہ اپنے شخصی معاملات میں اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں۔ انگریزی حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ جیسے دستوری اور نظری طور پر موجودہ بھارت میں بھی یہ بات تسلیم شدہ ہے اور تمام مذاہب کے حقوق دستور میں معین ہیں۔

بہر حال ایک ملک میں دین یعنی نظام اجتماعی ایک ہی رہ سکتا ہے۔ دو نظام نہ رہ سکتے ہیں نہ چل سکتے ہیں۔ جس طرح ایک نیام میں بیک وقت دو تلواریں نہیں سما سکتیں، اسی طرح ایک ملک میں دو نظام نہیں چل سکتے۔ ایک گدڑی میں بہت سے درویش سما سکتے ہیں، لیکن ایک شمال میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے۔ معلوم ہوا کہ ہر نظام اپنا غلبہ چاہتا ہے اور اگر اسلام محض مذہب نہیں، بلکہ دین ہے، جیسا کہ فی الواقع وہ ہے: ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾<sup>(۶)</sup> تو اس کو غلبہ درکار ہے۔ یہ منزل انگریزوں کی دو سو سالہ غلامی کی وجہ سے ہمارے ذہنوں سے

(۱) البینہ: 5 (۲) الانفال: 39 (۳) سورج سے زیادہ نمایاں (۴) ایک ساتھ ہونا

(۵) انگریزی حکومت (۶) آل عمران: 19



اوجھل ہو گئی تھی اور اب بھی بڑی مشکل سے یہ تصور لوگوں کے ذہنوں کے سامنے آ رہا ہے۔ چونکہ غلامی کے تقریباً دو سو سال کے درمیان اسلام دین نہیں رہا تھا، صرف مذہب بن گیا تھا، لہذا ہمارا سارا تصور اکثر و بیشتر تو پہلی منزل تک محدود ہے، یعنی عبادات اور حلال و حرام کے موٹے موٹے احکام ہم جانتے ہیں۔ دوسری منزل کی طرف بھی پیش رفت ہوئی، یعنی تبلیغ، دین کو پہنچانا، اسے عام کرنے کی کوشش کرنا۔ لیکن یہ بات ذہنوں سے اوجھل ہو گئی کہ ہمارا دین اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ اَلْحَقُّ يَعْلُوْ وَلَا يُعْلٰی عَلَيْهِ<sup>(۱)</sup>۔ اسلام دین ہے اور دین ہوتا ہی وہ ہے جو غالب ہو۔ علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب<sup>(۲)</sup>

اور آزادی میں بحر بیکراں<sup>(۳)</sup> ہے زندگی!

میں بڑے جزم<sup>(۴)</sup> کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام جب غالب ہوتا ہے تو دین ہوتا ہے اور جب مغلوب ہوتا ہے تو صرف مذہب رہ جاتا ہے۔ ہماری دو سو سالہ سیاسی اور فکری غلامی نے اس مذہبی تصور کو اس طریقے سے ہمارے ذہنوں میں نقش اور راسخ کر دیا ہے کہ اگر بڑی محنت کے بعد کسی کے سامنے یہ تصور واضح ہوتا ہے کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے تو تھوڑے عرصہ کے بعد مضحل ہو کر ذہنوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور پھر توجہ اس کے مذہبی تصور تک محدود ہو جاتی ہے۔ ہمارا اسلام کا محض مذہبی تصور انگریزی دور میں اتنا راسخ ہو چکا تھا کہ ہمارے بعض زعماء<sup>(۵)</sup> نے انگریز حکومت کی بھی بڑی مدح کی تھی کہ اس نے ہمیں بڑی مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ لہذا حکومت کے خلاف کوئی تحریک چلانا یا اس میں حصہ لینا مسلمانوں کے لیے قطعی نامناسب ہے۔ اسی پر مر و قلندر اقبال نے یہ پھبتی چست کی تھی۔

مُلا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت

ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

(۱) عربی مقولہ ”حق غالب ہوتا ہے اس پر کسی کا غلبہ نہیں ہوتا“، وفي الحديث ((اَلْاِسْلَامُ يَعْلُوْ وَلَا يُعْلٰی عَلَيْهِ)) جامع الصغیر لسیوطی عن عائذ بن عمرو ورواه الطحاوی فی مشکل الآثار

موقوفہ علی ابن عباسؓ

(۲) کم پانی والی ندی (۳) نہایت وسیع سمندر (۴) یقین (۵) لیڈر

اسلام کا غلبہ اور اسلام کا ایک دین کی حیثیت سے بالفعل قائم و نافذ کرنا یہ ہے ہمارے فرائض دینی کی تیسری اور بلند ترین منزل۔

### اقامت دین کا مرحلہ اور تصادم

اب آئیے ایک قاعدہ کلیہ اور اہل اصول کی طرف! وہ یہ کہ آپ اپنا نظام لانا چاہتے ہیں تو فی الوقت نافذ و قائم نظام کو ہٹانا ہوگا۔ جیسا کہ مولا ناروٹ نے کہا۔  
گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند  
می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند<sup>(۱)</sup>

انقلاب کے لیے یہ عمل لازم و لابدی اور ناگزیر ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جو نظام بھی کہیں قائم ہوتا ہے، اس کے ساتھ کچھ لوگوں کے مفادات، چودھراہٹیں، سیادتیں اور قیادتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ مراعات یا فتنہ طبقات جن کو اپنے حق سے زیادہ مل رہا ہے، جو دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں، جن کے پاس اختیارات اور حقوق کا ناجائز ارتکاز<sup>(۲)</sup> ہو گیا ہے، وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی اس نظام کو چھیڑے اسے ہاتھ لگائے۔ وہ تو اس کے تحفظ کے لیے فوراً اٹھ کھڑے ہوں گے کہ ع

”نظام کہنہ کے پاسبانو! یہ معرض انقلاب<sup>(۳)</sup> میں ہے“

ہوش میں آؤ، اپنی قوتوں کو مجتمع کرو، یہ ایک آندھی آ رہی ہے جو تمہارے مفادات اور تمہاری مراعات کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر لے جائے گی۔ یہ کشمکش بڑی شدید ہے۔ قرآن مجید میں تین مقامات پر یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾

(التوبة: ۳۳، الفتح: ۲۸، الصف: ۹)

اور ان میں سے دو مقامات پر آیت کا خاتمہ ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ کے الفاظ پر ہوا ہے۔ یعنی یہ ایک اہل قانون ہے کہ مشرک کبھی دین حق کا غلبہ برداشت نہیں کر سکیں

(۱) رومی نے کہا کہ جس بھی پرانی عمارت کی تعمیر (نو) کرتے ہیں۔ آپ نہیں جانتے پہلے اس عمارت کو تباہ کرتے ہیں۔ (۲) جمع ہونا (۳) انقلاب کی زد

گے۔ تصادم ہو کر رہے گا۔ اب نظریاتی تصادم اگلے مرحلہ میں داخل ہو گا اور بالفعل (Physical) تصادم ہوگا۔ اب طاقت، طاقت سے ٹکرائے گی۔

اس بالفعل تصادم (Physical Collision) کے بھی تین مرحلے ہیں۔ اس کے پہلے مرحلہ کو ہم کہیں گے ”صبر محض“ کہ ماریں کھاؤ مگر اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ بارہ برس مکہ میں یہی حکم رہا کہ اگر تمہیں دیکھتے ہوئے انگاروں پر ننگی پیٹھ لٹایا جا رہا ہے تو لیٹ جاؤ، مگر جوابی کارروائی نہیں کر سکتے۔ اس کو جدید اصطلاح میں کہیں گے: Passive Resistance<sup>(۱)</sup>۔ یعنی کلمہ تو حید اور کلمہ طیبہ پر قائم رہو، لیکن ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔

اس تصادم کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اگر طاقت اتنی فراہم ہو گئی ہے کہ اقدام کیا جاسکتا ہے تو آگے بڑھو اور باطل کو لٹا کر اور چیلنج کرو۔ اس نظام کی کسی دھکتی ہوئی رگ کو چھیڑو۔ اسے جدید اصطلاح میں کہا جائے گا Active Resistance یعنی اقدام۔

اس کا تیسرا اور آخری مرحلہ ہے Armed Conflict یا مسلح تصادم یعنی اب ہاتھ بھی کھول دیے گئے ہیں اور اذن قتال دے دیا گیا ہے:

﴿اِذْنًا لِلَّذِينَ يُفْتَلُونَ بِاَنَّهُمْ ظَلَمُوا ۖ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ﴾

(الحج)

”(آج سے) ان لوگوں کو اجازت دے دی گئی جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے“

کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر پوری قدرت رکھتا ہے۔“

مکی دور صبر محض کا دور تھا۔ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے بعد نبی اکرم ﷺ نے اقدام فرمایا اور چھاپے مار دے تبھی کرقریش کی تجارت کے دونوں راستوں کو جو مکہ سے یمن اور مکہ سے شام کی طرف جاتے تھے، مخدوش<sup>(۲)</sup> بنا دیا۔ گویا قریش کی دھکتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا، کیونکہ ان کی معاش کا بہت بڑا انحصار ان ہی راستوں کے ذریعہ تجارت پر تھا۔ صبر محض کے بعد ہر انقلابی عمل میں ”مسلح تصادم“ کا لازمی اور آخری مرحلہ آتا

ہے۔ یہ انقلابی دعوت وقت کے جن فراعنہ<sup>(۱)</sup> کے مفادات کو چیلنج کرتی ہے، وہ جب اس دعوت کو توسیع پذیر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس کو کچلنے کے لیے اپنی عسکری طاقت کو میدان میں لاتے ہیں اور اس طرح مسلح تصادم کا تیسرا اور آخری مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہر انقلابی دعوت کو لازماً اس آخری مرحلہ سے سابقہ پیش آ کر رہتا ہے۔ اس لیے کہ یہ انقلابی دعوت وقت کے رائج و نافذ نظام کے ساتھ retaliate<sup>(۲)</sup> کرتی ہے۔ اب تک تو وہ جھیل رہی تھی، برداشت کر رہی تھی، لیکن جب وہ اقدام کا مرحلہ شروع کرتی ہے تو نظام باطل اس کو کچلنے کے لیے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بڑھتا ہے اور آخری مرحلے پر مسلح تصادم کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسلامی انقلاب کی صورت میں یہی مسلح تصادم جہاد کی آخری چوٹی ”قتال فی سبیل اللہ“ بن جاتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کی انقلابی جدوجہد میں ایک وقت وہ تھا کہ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی، لیکن آخری مرحلے پر وہ وقت بھی آیا کہ جس کے متعلق حکم الہی آتا ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكُونُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (البقرة)

”(مسلمانو!) تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے اور وہ تمہیں ناپسند ہے اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں کوئی چیز ناپسند ہو اور ناخالیکہ اسی میں تمہارے لیے خیر ہو اور ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں پسند ہو اور ناخالیکہ اس میں تمہارے لیے شر ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔“

اس قتال کا ہدف (target) یہ ہے کہ مسلمانو! اب جبکہ تمہاری تلوار نیام سے باہر آ گئی ہے، تو یہ اُس وقت تک نیام میں نہیں جائے گی جب تک فتنہ و فساد بالکل فرو نہ ہو جائے اور اللہ کے خلاف بغاوت بالکل کچل نہ دی جائے اور دین کل کا کل اللہ ہی کے لیے نہ ہو جائے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كَلَهُ لِلَّهِ﴾

(الانفال: ۳۹) یہاں فتنہ سے مراد کیا ہے اس کی ہمارے اکثر اصحاب علم مختلف تشریحات و توجیہات کرتے ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ چونکہ ہمارا دین کا تصور غیر انقلابی بن گیا ہے لہذا جہاں کہیں بھی انقلابی بات آتی ہے تو پہلو بچا کر نکلنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فتنوں کا شمار مشکل ہے، استحصال<sup>(۱)</sup> بھی فتنہ ہے، نا انصافی بھی فتنہ ہے، لیکن وہ اصل فتنہ کیا ہے جو اس آیت میں مراد ہے اور جو اُمّ الفتن<sup>(۲)</sup> ہے؟ وہ یہ ہے کہ یہ زمین اللہ کی ہے اس کا جائز حاکم صرف اُس کی ذات ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿لَكَ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ اگر زمین پر تشریحی معاملات اور اجتماعی نظام حیات میں اللہ کے سوا کسی اور کا حکم چل رہا ہے تو یہ اس کے خلاف صریح بغاوت ہے۔ یہی سب سے بڑا فتنہ ہے۔

یہاں فتنہ سے اصلاً یہی فتنہ مراد ہے۔ اسی کے متعلق ایک مقام پر فرمایا گیا: ﴿وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (البقرة: ۱۹۱) اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا: ﴿وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (البقرة: ۲۱۷) غور کیجئے وہاں قتال و مقاتلہ کن کے خلاف تھا! اپنی ہی قوم اور اپنے قبیلہ کے لوگ اپنے ہی بھائی بند اپنے ہی اعزہ و اقارب مد مقابل تھے، لیکن وہ طاغوتی نظام کے علمبردار تھے اور اُمّت محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اس بات پر مامور کی گئی تھی کہ اجتماعی نظام خالصتاً توحید کے انقلابی نظریے پر قائم ہو۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ﴾ (الزمر: ۳) اور: ﴿أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ﴾ (الشورى: ۱۳) سورۃ التوبہ اور سورۃ الصف میں جہاں خاتم النبیین والمرسلین علیہ السلام کی بعثت کی امتیازی شان یہ بیان ہوئی ہے: ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾ تو دونوں مقامات کے آخر میں فرمایا گیا: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ اور چاہے مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو!

جن لوگوں کے مفادات اور جن کی قیادت و سیادت نظام باطل سے وابستہ ہو وہ اس بات کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ ان کا طاغوتی نظام بیخ و بن<sup>(۳)</sup> سے اکھاڑ کر توحید پر مبنی

(۱) ناجائز حصول (۲) فتنوں کی ماں مراد ہے بڑا فتنہ (۳) جڑ اور بنیاد

نظامِ عدل و قسط قائم کیا جائے۔ وہ تو مزاحمت کریں گے، مخالفت کریں گے اور اپنی پوری طاقت دین اللہ کے قیام و نفاذ کو روکنے کے لیے صرف کر دیں گے۔ لہذا اللہ کے فرماں برداروں کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اللہ کے باغیوں سے پنجہ آزمائی کریں، ان سے نبرد آزما ہوں اور اللہ تعالیٰ کی تشریحی حکومت کو قائم کرنے کے لیے اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کر دیں، تاکہ ”حق بحق دارر سید“<sup>(۱)</sup> والا معاملہ ہو جائے۔ جو لوگ یہ قربانی دیں تو وہ سرخرو ہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا﴾ (الاحزاب)

”اہل ایمان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے (اس کی راہ میں گردنیں کٹا کر سرخرو ہو چکے ہیں) پس ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی اپنی باری آنے کا منتظر ہے اور ان اہل ایمان نے اپنے اس رویے اور طرزِ عمل میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں کی۔“

لیکن اگر ایمان کے دعوے دار بیٹھے رہیں، باطل کے ساتھ کوئی کشمکش نہ کریں، بلکہ اس کے زیرِ عافیت چین کی بانسری بجائیں، اپنے معیارِ زندگی کی بلندی ہی مقصود و مطلوب بن جائے تو یہ طرزِ عمل دُنیوی قانون میں بھی اعانت<sup>(۲)</sup> جرم ہے۔ یہ باغیوں کے ساتھ ایک نوع کا تعاون قرار دیا جاتا ہے۔ ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾<sup>(۳)</sup> کا سب سے بڑا سبب یہی بغاوت ہوتی ہے۔ کائنات کے تکوینی نظام پر جس اللہ کی حکومت قائم ہے، یہ زمین اسی اللہ کی ہے، لہذا اس پر اس کی تشریحی حکومت بھی قائم ہونی چاہیے۔ ﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ﴾<sup>(۴)</sup> حکم دینے کا اختیار صرف اسی کو حاصل ہے۔ لیکن اس اصل الاصول کو چھوڑ کر خواہ کوئی فرد واحد ہو، کوئی قوم ہو، عوام ہوں، کسے باشد<sup>(۵)</sup>، کوئی بھی ہو، وہ اگر اپنا حکم چلوا رہا ہے تو درحقیقت وہ خدائی کا مدعی ہے اور اللہ کا باغی ہے۔ مسلمان تو وہ ہے جو صرف اللہ کا وفادار ہو۔ اس موقع پر اچانک میرا ذہن اس مقدمہ بغاوت کی طرف منتقل ہوا جو ہمارے ہی شہر کراچی

(۱) حق دار کو حق پہنچ گیا (۲) مدد (۳) بحر و بر میں فساد پھیل گیا (الروم: ۴۱) (۴) کوئی ہو

کے خالق دینا ہال میں ہمارے چند اکابر کے خلاف پہلی جنگ عظیم کے دوران قائم ہوا تھا۔ یہ مقدمہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ ہماری تاریخ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کے ذکر سے ہمیں کسی درجے میں سہارا ملتا ہے کہ انہوں نے وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو ایک مسلمان کے شایانِ شان ہے۔ ان اکابر نے پہلی جنگ عظیم کے اس ٹریبونل کے سامنے جو انگریزی حکومت نے بغاوت کے مقدمہ کے لیے قائم کیا تھا، برملا کہا تھا کہ ہاں ہم انگریزی حکومت کے باغی ہیں، اس لیے کہ مسلمان صرف اللہ کا وفادار ہو سکتا ہے، وہ کبھی غیر اللہ کا وفادار نہیں ہو سکتا!

### ایمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں

بہر حال یہ ہیں جہاد کے تین درجے۔ ان کو مزید پھیلائیں گے تو نو (9) درجے بن جائیں گے اور نویں منزل پر جا کر یہ جہاد قاتل بنتا ہے جو اس کی چوٹی اور اس کا نقطہٴ عروج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الصف میں جہاد کی بات ہوئی یہ بات صراحت سے سامنے آتی ہے کہ جہاد تو ایمان کی بنیاد (base) ہے۔ جہاد نہیں کرو گے تو عذابِ جہنم سے چھٹکارا پانے کی امید محض امیدِ موهوم ہے۔ ﴿تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ﴾ ”یہ محض تمہاری خوش فہمیاں ہیں“۔ اس کی کوئی برہان اور دلیل تمہارے پاس نہیں ہے۔ عذابِ الیم سے رستگاری<sup>(۱)</sup> کے لیے ایمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ اسی سورۃ مبارکہ میں فرمایا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۖ تُوْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ۖ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝﴾

”اے اہل ایمان! میں بتاؤں تمہیں وہ تجارت جو تم کو عذابِ الیم سے نجات دلا دے؟ (وہ یہ ہے کہ) ایمان (پختہ) رکھو اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اس کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔“

معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ جہاد ناگزیر ہے۔ اس سے تومفر<sup>(۱)</sup> ہے ہی نہیں۔ یہ تو نجات کی شرط لازم ہے۔ قرآن مجید تو یہ بتاتا ہے کہ جہاد نہیں تو ایمان نہیں۔ دلیل کے لیے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ دیکھئے! فرمایا:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصُّدُوقُونَ﴾

”مؤمن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر اس شان سے ایمان لائے کہ ان کے قلوب تکلیک<sup>(۲)</sup> اور غلجیان<sup>(۳)</sup> میں نہیں پڑے (بلکہ ان کو یقین قلبی حاصل ہو گیا) اور جنہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں۔ بس صرف یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔“

اس آیت مبارکہ میں حصر کے دو اسلوب آئے ہیں ایک اِنَّمَا اور دوسرے اُولَٰئِكَ هُمُ الصُّدُوقُونَ۔ اسی لیے میں نے ترجمانی میں اس اسلوب کو پیش نظر رکھا ہے۔

آگے چلیے۔ اگر کوئی دُنیوی محبت اللہ کی راہ میں جہاد سے روکنے کے لیے پاؤں میں بیڑی بن کر پڑی تو قرآن مجید کا فتویٰ کیا ہے! اس کے لیے سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ ملاحظہ کیجیے:

﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ نَّافَقْتُمْ بَهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسْكَنٌ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾

اللہ کی محبت اس کے رسول (ﷺ) کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت کی عظمت و اہمیت پر قرآن حکیم کی یہ بڑی جامع اور مہتمم بالشان آیت ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کے سامنے ایک معیار اور کسوٹی رکھ دی گئی ہے۔ ان سے فرمایا گیا ہے کہ اپنے باطن میں ایک ترازو نصب کر لو اور پھر جائزہ لے لو کہ تمہاری اصلی دلی محبتوں کا کیا حال ہے۔ فرمایا کہ اے نبی ﷺ! ان مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ اپنے دل میں نصب شدہ میزان کے ایک پلڑے میں آٹھ محبتیں ڈالو۔ یعنی اپنے باپوں کی محبت، اپنے بیٹوں کی محبت، اپنے بھائیوں کی محبت،



اپنی بیویوں کی محبت اور اپنے رشتہ داروں اور اعزہ و اقارب کی محبت۔ ماں، بیٹی، بہن اور شوہر کی محبتوں کا بھی ان میں احاطہ ہو گیا۔ یہ پانچ محبتیں علائقِ دُنیوی سے متعلق ہیں۔ پھر ان کے ساتھ چھٹی محبت اس مال کی جو بڑے چاؤ کے ساتھ تم نے جمع کیا ہے، ساتویں اس کا روبرو کی محبت جو تم نے بڑی محنت سے جمایا ہے، جس میں تم نے خونِ پسینہ ایک کیا ہے، جس کے متعلق تم کو اندیشہ لاحق رہتے ہیں کہ کہیں کساد بازاری<sup>(۱)</sup> نہ آجائے، کہیں گھانا نہ ہو جائے، اور آٹھویں ان مکانوں کی محبت جو تم نے بڑے ارمانوں سے تعمیر کیے ہیں، جن کی زیبائش و آرائش پر تم نے پانی کی طرح پیسہ لگایا ہے۔ یہ تین محبتیں اسباب و سامانِ دُنیوی سے متعلق ہیں۔ اب تقابل کے لیے دوسرے پلڑے میں تین محبتیں ڈالو۔ ایک اللہ کی محبت، دوسری اس کے رسول (ﷺ) کی محبت اور تیسری اس کی راہ میں جہاد کی محبت۔ اب دیکھو کون سا پلڑا بھاری پڑا، کون سا جھکا! اگر ان آخر الذکر محبتوں کا پلڑا ہلکا رہ گیا اور علائقِ دُنیوی کی محبتوں والا پلڑا بھاری پڑ گیا تو جاؤ گوگو<sup>(۲)</sup> کی حالت میں مبتلا رہو اور انتظار کرو! میں محاورے کے طور پر فِتْرَتُصُّوْا کا صحیح مفہوم ادا کرنے کے لیے کہا کرتا ہوں کہ ”جاؤ دفع ہو جاؤ“ ﴿حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾ ﴿۳۶﴾ ”حتیٰ کہ اللہ اپنا فیصلہ سنادے اور اللہ ایسے فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

یہاں فاسق کا لفظ انتہائی قابلِ توجہ ہے۔ جس مسلمان کا دل جہاد کی محبت سے خالی اور اس کی اہمیت و عظمت سے غافل ہے اس کا شمار بھی فاسقوں میں ہوتا ہے۔ میرا ظن غالب ہے کہ اسی آیت مبارکہ سے متاثر ہو کر قبائل نے یہ شعر کہا تھا:

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند<sup>(۳)</sup>

بتانِ وہم و گماں لا الہ الا اللہ

معلوم ہوا کہ جہاد سے تو مفر ہے ہی نہیں۔ سورۃ الحجرات کی متذکرہ بالا آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے بلکہ میرے غور و فکر کی حد تک نصِ قطعی ہے کہ ایمانِ حقیقی کے دورِ کن ہیں: ایک ہر نوع کے ریب و تشکیک اور ذہنی خلجان سے مُبرّا<sup>(۴)</sup> یقینِ قلبی اور دوسرا اللہ کی راہ

(۱) مندا ہونا (۲) تذبذب (۳) تعلق (۴) پاک

میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد۔

بلاشبہ کلمہ شہادت، اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، حج اور صوم رمضان، پانچ ارکان اسلام ہیں۔ ان میں شہادتین کو بنیاد اور دوسرے چار کو ستون کا مقام حاصل ہے۔ بنیاد اور ستون کے بغیر کسی عمارت کی تعمیر کا تصور ممکن ہی نہیں، لہذا میں فرائض دینی کے جامع تصور کو ظاہر کرنے کے لیے جو تین منزلہ عمارت کی مثال پیش کیا کرتا ہوں اس کی ہر منزل کے لیے یہ ارکان اسلام ناگزیر ہیں۔ لیکن ایمان حقیقی کے دور کن ہیں۔ ایک قلبی یقین اور دوسرا جہاد فی سبیل اللہ۔ جہاں تک میں نے غور و فکر کیا ہے، نجات کا کوئی دوسرا راستہ اس جہاد کے بغیر مجھے نظر نہیں آتا۔ سورۃ العصر میں نجاتِ آخری کے جو ناگزیر لوازم بیان فرمائے گئے ہیں ان میں تیسرا لازمہ اور تیسری ناگزیر شرط ”تواصی بالحق“ قرار دی گئی ہے۔ سورۃ ہود کی پہلی آیت مبارکہ میں یہ اصول بیان فرمایا گیا ہے:

﴿الَّذِينَ كَفَرُوا كُتِبَ عَلَيْهِمْ أَنْ يَصِلُوا إِلَى اللَّهِ فَمَا يَصِلُونَ إِلَّا إِلَى اللَّهِ فَتُصَلَّتْ عَنْهُمْ سَبِيلٌ ۝۱﴾

”ال ر۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں، پھر صاف صاف بیان کی گئی ہیں ایک حکیم باخبر کی طرف سے۔“

چنانچہ قرآن حکیم اسی تواصی بالحق کی شرح کے لیے مزید کئی اصطلاحات بیان کرتا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح بھی اس کی توضیح و تشریح اور تفصیل ہے۔

### جہاد کی چوٹی: قتال فی سبیل اللہ

قتال فی سبیل اللہ اسی جہاد فی سبیل اللہ کی چوٹی اور اس کا ذرۂ سنام<sup>(۱)</sup> ہے۔ یہ مقام محبوبیت ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَانَهُمْ بَنِيَانٌ مَرصُوعُونَ﴾ (الصّف) ”یقیناً اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اُس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔“

سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمُوتَ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا

تَشْعُرُونَ ﴿١٦٩﴾

”اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انہیں مردہ مت کہو، وہ زندہ ہیں، مگر تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور نہیں ہوتا۔“

اور سورہ آل عمران میں فرمایا:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ

يُرْزَقُونَ ﴿١٧٠﴾

”اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پارہے ہیں۔“

یہ وہ اعلیٰ و ارفع مرتبہ ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ اس کی تمنا اور آرزو فرمایا کرتے تھے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((كُوِدْتُ اَنْيَ اُقْتَلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلَ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلَ)) (١)

”میرے دل میں بڑی آرزو اور بڑی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جائے، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں۔“

کتبِ احادیث میں نبی اکرم ﷺ کی یہ دعائیں منقول ہیں:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ شَهِادَةً فِیْ سَبِیْلِكَ))

اور:

((اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِیْ شَهِادَةً فِیْ سَبِیْلِكَ)) (٢)

(١) صحیح البخاری، کتاب التمنی، باب ما جاء فی التمنی ومن تمنی الشهادة۔

وصحیح مسلم، کتاب الامارة، باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل اللہ۔

(٢) یہ دعا امام بخاری نے اپنی صحیح میں کتاب فضائل مدینہ کے تحت عبد اللہ ابن عمرؓ کی دعا کے طور پر نقل کی ہے اور اس کے الفاظ ہیں ((اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِیْ شَهِادَةً فِیْ سَبِیْلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِیْ فِیْ بَلَدِ رَسُوْلِكَ ﷺ)) ”اے اللہ مجھے اپنے راستے میں شہادت عطا کر اور میری موت اپنے رسول ﷺ کے شہر میں مقدر کر دے۔“ نیز امام مالکؒ نے موطا اور امام عبد الرزاق نے مصنف میں بالکل اسی مفہوم کی دعا حضرت عمرؓ کی دعا کے طور پر نقل کی ہے۔ البتہ کتب احادیث و سیرت میں باوجود تلاش بسیار کے یہ دعا نبی اکرمؐ

لیکن سورۃ المجادلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ سنت بیان فرمائی ہے:

﴿كَتَبَ اللَّهُ لَا غُلَبَ لَنَا أَنَا وَرُسُلُنَا إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾

”اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے (یعنی طے فرما دیا ہے) کہ میں اور میرے رسول ہی

غالب ہو کر رہیں گے۔ یقیناً اللہ ہی زور آور اور زبردست ہے۔“

رسولوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص تحفظ حاصل ہوتا ہے اور وہ مقتول نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ عالم ظاہری میں اس طرح رسول کے مغلوب ہونے کا پہلو نکلتا ہے، البتہ انبیاء علیہم السلام کو یہ خصوصی تحفظ نہیں دیا گیا۔ چنانچہ ان میں سے بعض قتل بھی کیے گئے، جس کی سب سے بڑی مثال حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل ہے۔

ضمناً یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ رفع آسمانی کی یہ بھی ایک دلیل ہے، کیونکہ وہ بھی ایک رسول تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بھی ہے کہ جس قوم کی طرف رسول مبعوث کیا جاتا ہے وہ قوم اگر رسول کا انکار کر دے اس پر صرف معدودے چند لوگ ہی ایمان لائیں تو اہل ایمان کو بچا کر اس قوم کو عذاب استیصال کے ذریعہ اسی دنیا میں ہی تباہ و برباد اور ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔ ﴿وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَبْنِيْ اِسْرَآئِيْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ﴾ (صف: 6) بنی اسرائیل نے آنجناب کا انکار کیا لیکن انہیں عذاب استیصال سے نیست و نابود نہیں کیا گیا۔ یہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کے لیے دلیل ہے۔ حضرت مسیح قرب قیامت میں جناب محمد ﷺ کے امتی کی حیثیت سے نزول فرمائیں گے اور ان شاء اللہ انہی کے ہاتھوں تمام یہودی عذاب استیصال و ہلاکت کا مزہ چکھیں گے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ایمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں اور جہاد کی چوٹی قتال ہے۔ البتہ قتال ہر وقت نہیں ہوتا، موقع و محل کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی اسلامی حکومت بالفعل قائم ہو اور اسے غیر مسلموں سے فی سبیل اللہ جنگ کا مرحلہ درپیش ہو اور حالات کے

---

۴۴ کے الفاظ میں مل نہ سکی جن جن محدثین و مصنفین نے اسے نقل کیا ہے وہ انہی دو حضرات کے حوالے سے نقل کیا ہے (واللہ اعلم)

لحاظ سے حسب ضرورت فوج موجود ہو یا مزید ضرورت کے لیے لوگ جنگ کے لیے نکل آئیں تو قتال فرض عین نہیں فرض کفایہ ہو جائے گا۔ لیکن ”جہاد“ وہ چیز ہے جو ایک مسلمان پر شعور کی عمر کو پہنچتے ہی فرض ہو جاتا ہے۔ اس جہاد کے مختلف مدارج ہیں، جن میں سے بعض کا میں قدرے تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں اور بعض کی طرف میں نے محض اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ ”قتال“ اس جہاد کے عمل کی آخری چوٹی اور اس کا ذرۂ سنام ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے لگائیے جو صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: ((مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهُ مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِّنْ نَّفَاقٍ)) <sup>(۱)</sup>

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص اس حال میں مر جائے کہ نہ تو اُس نے اللہ کی راہ میں جنگ کی ہو اور نہ ہی اس کے دل میں اس کا خیال آیا ہو (اس کی تمنا اور آرزو بھی پیدا نہ ہوئی ہو) تو ایسے شخص کی موت ایک نوع کے نفاق پر ہوگی۔“  
بقول اقبال۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن  
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی <sup>(۲)</sup>

### جہاد کے لیے جدید اصطلاح: انقلابی عمل

اگرچہ میں بھی اس بات کا قائل ہوں کہ ہمیں حتی الامکان جدید اصطلاحات سے احتراز کرنا چاہیے اور کتاب و سنت کی اصل اصطلاحات سے چمٹے رہنا چاہیے، عافیت اسی میں ہے، ورنہ بالکل غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر غلط نظریات اذہان میں ریگ کر آ جاتے ہیں اور پیوست ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک یہ دشواری بھی پیش آتی ہے کہ ہر دور کی اپنی زبان ہوتی ہے، ہر دور کی چند مخصوص اصطلاحات ہیں جو بات کی تفہیم کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اگر اس زبان میں ان اصطلاحات کے ساتھ بات نہیں کی جائے گی تو

(۱) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من مات ولم یغزو لم یحدث نفسه بالغزو

(۲) ملک فتح کرنا

ابلاغ کا حق ادا نہیں ہوگا۔ لہذا میرے نزدیک درمیانی راہ یہ ہے کہ وقتی طور پر ابلاغ اور افہام کے لیے ان اصطلاحات کو استعمال ضرور کیا جائے۔ لیکن اپنے فکر کو مستقلاً اُن اصطلاحات کے حوالے سے استوار کیا جائے جو کتاب و سنت کی ہیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر میں یہ بات عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ ”جہاد“ کے لیے آج کے دور کی اصطلاح ہے ”انقلاب“۔ انقلابی عمل ہی دراصل جہاد ہے۔ البتہ اس میں تھوڑا سا فرق واقع ہوتا ہے۔ میں نے جہاد کے حوالے سے جو تین سطحیں (Levels) بیان کی ہیں انقلابی عمل میں ان کی ترتیب بدل جائے گی۔ جب ہم انقلاب کی بات کریں گے تو سب سے پہلے دعوت کا مرحلہ آئے گا۔ اس لیے کہ ہر انقلابی فکر کی propagation اس کی نشر و اشاعت اس کو پھیلانا اس کو عام کرنا اسے ذہنوں میں اتارنا اس کو دلائل کے ساتھ حق ثابت کرنا اس انقلابی عمل کا نقطہ آغاز ہوتا ہے۔ لہذا اس طرح درمیانی منزل اب پہلی ہو گئی ہے۔

### انقلابی عمل کے لیے تنظیم ناگزیر ہے

انقلابی عمل کا دوسرا مرحلہ کیا ہوتا ہے! یہ کہ جو لوگ اس فکر کو قبول کریں انہیں منظم کیا جائے۔ اس لیے کہ انقلاب بغیر جماعت کے نہیں آتا۔ میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ انفرادی طور پر دین کا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ انفرادی سطح پر تبلیغ ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی سب سے اعلیٰ اور درخشاں مثال حضرت نوح علیہ السلام کی ہے کہ ساڑھے نو سو برس دعوت دیتے رہے۔ سورہ نوح کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب علیہ السلام نے کس کس طور اور طریقے سے دعوت و تبلیغ کے فریضہ کی انجام دہی کے لیے مساعی کیں اور پھر کتنی حسرت کے ساتھ بارگاہ الہی میں عرض کیا کہ:

﴿رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ۚ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا ۚ  
وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا  
ثِيَابَهُمْ وَأَصْرَوْا وَاسْتَكْبَرُوا ۚ وَاسْتَكْبَرُوا ۚ ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جَهَارًا ۚ ثُمَّ إِنِّي  
أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ۚ﴾

”اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز تیری طرف بلایا، مگر

میری دعوت نے اُن کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔ اور جب بھی میں نے اُن کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے مُنہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پراڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے انہیں با واز بلند دعوت دی۔ پھر میں نے اعلانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔“

لیکن قوم مُردہ ہو چکی تھی۔ اس نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتِ توحید کو قبول نہیں کیا، بلکہ اس سے اعراض و انکار کیا۔ ساڑھے نو سو برس کی دعوت و تبلیغ کا جو نتیجہ نکلا اس کو سورہ ہود کی آیت ۴۰ کے آخر میں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَمَا اٰمَنَ مَعَهُ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ ”اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اس (نوح) کے ساتھ ایمان لائے تھے۔“ یہاں ”قلیل“ وہ معنی دے رہا ہے جو انگریزی میں a little دیتا ہے، یعنی بہت ہی کم، معدودے چند۔ قرآن حکیم میں تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ پر ان کے گھر والے ہی ایمان لائے تھے اور ان میں سے بھی ایک بیٹے نے دعوتِ حق قبول نہیں کی تھی، وہ کفر پر ہی اڑا رہا تھا۔ ممکن ہے کہ انگلیوں پر گنے جانے والے چند اور لوگ بھی ایمان لائے ہوں، بہر حال ساتھی نہ ملے، جمعیت فراہم نہیں ہوئی، لہذا اگلا قدم کیسے اٹھتا! اعوان و انصار نہ ہوں تو اگلی منزل کی طرف پیش رفت کیسے ہو! لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی استقامت و مصابرت دیکھئے کہ ساڑھے نو سو برس دعوت و تبلیغ میں کھپا دیے اور اپنا فرض منصبی ادا کر دیا۔ ہمارے لیے اس میں یہ سبق ہے کہ ایک مخلص شخص اپنی پوری زندگی اس کام میں لگا دے، وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخرو اور کامیاب ہوگا۔ معاشرہ اگر مر چکا ہے، حق کو قبول کرنے کی صلاحیت معدوم ہو چکی ہے تو کوئی مثبت جواب نہیں ملے گا، ساتھی میسر نہیں آئیں گے۔ اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ چونکہ اگلا قدم اٹھانے اور اگلی منزل کی طرف پیش رفت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، لہذا وہ بری الذمہ ہے۔

اسی طرح تربیت و تزکیہ تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف یہ سارے کام دین کے ہیں اور یہ انفرادی طور پر بھی ہو سکتے ہیں اور بحمد اللہ ہمارے یہاں یہ سب ہی کام ہو رہے ہیں۔ لیکن جب آخری منزل اور اصل ہدف کی بات ہوگی جس کو میں اب انقلاب سے تعبیر

کر رہا ہوں، یعنی دین کا غلبہ دین کا قیام دین کا نفاذ دین کی سر بلندی، تو کوئی احمق شخص ہی ہو سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ یہ کام انفرادی طور پر ممکن ہے۔ بلکہ ایسا خیال رکھنے والا شخص فاطر العقل<sup>(۱)</sup> ہی ہو سکتا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ تنظیم کے بغیر کوئی اجتماعی کام نہیں ہو سکتا، چاہے وہ خیر کے لیے ہو چاہے شر کے لیے ہو۔ جو اشخاص لوگوں کی جیسیں کاٹتے ہیں، ان کی بھی تنظیم ہوتی ہے۔ ڈاکوؤں کے بھی گروہ (gangs) ہوتے ہیں، تنظیم ہوتی ہے۔ تخریب کاری کے لیے بھی تنظیمیں قائم ہیں۔ لہذا اقامت دین اور اظہار دین کے لیے تنظیم اور جماعت ناگزیر ہے اس سے مفر نہیں۔ بقول فیض احمد فیض۔

جز دار<sup>(۲)</sup> اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ

ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں!

حضرت نوح علیہ السلام کے بالکل برعکس دوسری مثال میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی دیا کرتا ہوں۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ میں جن پانچ اولوالعزم رسولوں کا ذکر ہوا ہے، ان میں زمانی ترتیب کے لحاظ سے اولین ہیں حضرت نوح علیہ السلام اور آخری ہیں جناب محمد ﷺ۔ درمیان میں تین رسول ہیں، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام بالکل وسط میں آتے ہیں۔ اب دیکھئے، اول و آخر میں کتنی متضاد کیفیت ہے کہ ایک نے ساڑھے نو سو برس دعوت دی، لیکن کوئی اعوان و انصار نہیں ملے۔ جمعیت ہی فراہم نہیں ہوئی تو اگلا قدم کیسے اٹھے! اور دوسرے کا معاملہ یہ ہے کہ کل بیس برس میں دنیا کا عظیم ترین صالح انقلاب برپا فرما دیا۔ بیس سال فتح مکہ اور اس کے بعد غزوہ حنین کی کامیابی کے اعتبار سے کہہ رہا ہوں، کیونکہ اس کے ساتھ ہی جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلاب اسلامی کی تکمیل ہو گئی تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد میں ماہ الا تیا ز اور فیصلہ کن چیز کیا ہے! اسے سورۃ الفتح کی آیات ۲۸، ۲۹ کے حوالے سے سمجھئے۔ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۖ

وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ۖ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى



الْكَفَّارِ رَحْمَاءُ بَيْنَهُمْ.....﴾

”وہ (اللہ) ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت کاملہ اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں.....“

بقول شاعر مشرق۔

ہو حلقہٴ یاراں تو بریشم کی طرح نرم  
رزم (۱) حق و باطل ہو تو فولا دے مومن!

محمد رسول اللہ ﷺ کی جمعیت اور تنظیم کو تصور میں تو لائیے۔ وہ لوگ کہ جن کی دین سے وابستگی اور دین کے لیے ایثار کا یہ عالم تھا کہ وہ اس شان سے نبی اکرم ﷺ کے اعوان و انصار بنے ہیں کہ ”ہر چہ بادا باد ماکشتی در آب انداختیم“ (۲) والا نقشہ ہے۔ جو غزوہ بدر سے قبل ایک مشاورت میں کہہ رہے ہیں کہ ”اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ ہم سے کیا پوچھ رہے ہیں! بسم اللہ کیجیے جو بھی آپ کا ارادہ ہو کیا عجب کہ اللہ ہمارے ذریعے آپ کو آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرمادے۔ جو کہہ رہے ہیں کہ حضور ﷺ! آپ ہمیں حضرت موسیٰ (ع) کے ساتھیوں پر قیاس نہ فرمائیے جنہوں نے کہا تھا:

﴿فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هُنَا قَاعِدُونَ﴾ (المائدة)

”پس (اے موسیٰ!) تم جاؤ اور تمہارا رب جائے اور دونوں جنگ کرو، ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے۔“

جہاں آپ کا پسینہ گرے گا وہاں اپنا خون بہانا ہمارے لیے سعادت ہوگی۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جملہ یاد کیجیے جو کہہ رہے ہیں کہ حضور! آپ ہم سے کیا مشورہ لے رہے ہیں! اَنَا اَمْنَا بِكَ وَصَدَقْنَاكَ۔ ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں، ہم آپ کی تصدیق کر چکے ہیں، ہم آپ کو اللہ کا رسول تسلیم کر چکے ہیں۔ اب خدا کی قسم! اگر آپ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں سمندر میں ڈال دیں گے۔ اگر آپ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی

(۱) معرکہ (۲) جو کچھ ہوتا ہے وہ ہم نے کشتی پانی میں ڈال دی ہے

اؤٹنیوں کو دہلا کر دیں گے لیکن برک الغماد تک جا پہنچیں گے (جو عرب کا ایک دور دراز علاقہ ہے جس کی راہ میں لق و دق صحرا پڑتا ہے۔)

یہ ہے وہ فیصلہ کن اور مابہ الامتیاز بات کہ اگر جمعیت نہ ہو اس میں بنیانِ مرصوص کی کیفیت نہ ہو اس میں سمع و طاعت کا وصف و جوہر نہ ہو اس میں نظم و ضبط نہ ہو وہ تربیت یافتہ نہ ہو اس کو اللہ کی رضا ہر چیز سے زیادہ محبوب نہ ہو اس کو زندہ رہنے سے زیادہ اللہ کی راہ میں جان دینا عزیز نہ ہو تو اگلی منزلوں کی طرف پیش رفت اور پیش قدمی کے مراحل آئیں گے ہی نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کو ایسے ساتھی نہ ملے لہذا اگلے مرحلے کا معاملہ درپیش ہی نہ ہوا۔ لیکن آنحضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسے اعوان و انصار مل گئے جنہوں نے دعوتِ توحید پر لبیک کہا، دعوتِ حق کو قبول کیا، اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالا اور انہوں نے دعوتِ الی اللہ اعلائے کلمۃ اللہ شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے لیے شہداء و مصائب فقر و فاقہ، کشمکش و تصادم، جہاد و قتال کے مراحل میں جاں نثاری، قربانی و ایثار، صبر و تحمل اور استقامت کی وہ مثالیں قائم کیں کہ ان کی نظیر تاریخِ انسانی نہ آج تک پیش کر سکی ہے اور نہ آئندہ پیش کر سکے گی۔ اللہ کی طرف سے حضور ﷺ کو ایسے جاں نثار اصحاب کا ملنا اس لیے بھی تھا کہ اظہارِ دین الحق آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھا، فحوائے ﴿لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾۔ چونکہ آپ آخری نبی اور رسول ہیں لہذا بنفس نفیس دینِ حق کو ایک نظامِ اجتماعی کی حیثیت سے قائم اور نافذ کر کے تاقیام قیامت نوعِ انسانی پر حجت قائم کرنا بھی آپ کے فرائض منصبی میں ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔

اب آئیے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ کی طرف۔ اولوالعزم من الرسل میں سے بالکل وسط میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ آنجناب کی بعثتیں بھی دونو عبتوں کی حامل تھیں۔ ایک آنجناب آلِ فرعون کی طرف رسول تھے۔ ﴿اٰذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰی﴾ (طہ) اور دوسرے آپ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ آنجناب کی دعا پر آپ کی معاونت کے لیے آپ کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت سے سرفراز فرمایا گیا تھا۔ مصر میں دونوں حضرات دعوت و تبلیغ اور بنی اسرائیل کی تربیت و تزکیہ میں ہمہ وقت و ہمہ تن

لگے رہے، حتیٰ کہ فرعون کے اعراض، سرکشی، دشمنی اور انکار کے باعث ہجرت کا مرحلہ آ گیا اور آپ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکل جائیں۔ آپ کے ساتھ لاکھوں کی جمعیت تھی۔ جب آپ بنی اسرائیل کے ہمراہ صحرائے سینا پہنچے تو اگلا اور آخری مرحلہ دین کے قیام اور غلبہ کے لیے قتال کا درپیش ہوا اور وحی الہی کے ذریعے حکم ہوا کہ ارض مقدس (فلسطین) میں داخل ہو جاؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا:

﴿يَقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خِيسِرِينَ﴾ (المائدة)

”اے برادرانِ قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے، اور پشت پھیر کر پیچھے مٹ پلٹو ورنہ ناکام و نامراد لوگو گے۔“

لیکن قوم بزدل اور تھڑ دلی نکلی اور اس نے کورا جواب دے دیا:

﴿قَالُوا يَمُوسَىٰ إِنَّا لَنُذْخِلُهَا أَبَدًا مَا دَامُوا فِيهَا فَادْهَبْ أَنْتَ وَرَبَّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَهُنَا قَاعِدُونَ﴾ (المائدة)

”انہوں نے کہا: اے موسیٰ! ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ (زبردست لوگ) وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمہارا رب دونوں جاؤ اور لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔“

نتیجہ یہ نکلا کہ انقلابی عمل وہیں رک گیا۔ اگر اقامتِ دین کا کام اجتماعی قوت اور منظم جمعیت کے بغیر ممکن ہوتا تو اللہ کے دو جلیل القدر پیغمبروں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیٰ نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام) کے مبارک ہاتھوں سے تکمیل پا جاتا۔ لیکن ساتھیوں کی بزدلی اور پیٹھ دکھانے کے باعث انقلابی عمل تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو اللہ کی طرف سے بشارت دی تھی کہ ارض مقدس تمہارے لیے لکھی جا چکی ہے، اب تمہاری ہمت درکار ہے، پیٹھ دکھاؤ گے تو ناکام و خاسر ہو جاؤ گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کی اس ڈھٹائی، نافرمانی، بزدلی اور کورے جواب سے اتنے آزرده اور دل گرفتہ ہوئے کہ ان کی زبان پر آ گیا:

﴿رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي فَافْرِقْ بَيْنَنَا وَقَوْمِ الْفَاسِقِينَ﴾ (المائدة)

”اے میرے رب! مجھے تو سوائے اپنی ذات اور اپنے بھائی کے کسی اور پر کوئی اختیار نہیں پس تو ہم میں اور ان نافرمانوں میں جدائی ڈال دے۔“  
 قوم کی اس بزدلی اور کم ہمتی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور پاداش اپنا حکم سنا دیا:  
 ﴿قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيَهُونَ فِي الْأَرْضِ ۖ﴾ (المائدة)  
 ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (ان کی نافرمانی اور بزدلی کی وجہ سے) ان پر ارض مقدس  
 چالیس سال تک حرام کر دی گئی ہے۔ اب یہ اسی صحرا میں (اس مدت تک) بھٹکتے  
 رہیں گے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ سے سبق ملتا ہے کہ اگر جمعیت موجود ہو لیکن وہ غیر منظم ہو، اس  
 میں سمع و طاعت کا جو ہرنہ ہو اس میں نظم و ضبط نہ ہو تو بھی انقلابی عمل آخری مرحلہ میں داخل  
 نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے وہ جماعت درکار ہے جس کے متعلق آنحضور ﷺ نے فرمایا:  
 ((أَمْرُكُمْ بِخُمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهَجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِي  
 سَبِيلِ اللَّهِ))<sup>(۱)</sup>  
 ”(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ التزام جماعت کا، اور سننے اور  
 ماننے کا، اور اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کا۔“

ایک اور روایت میں ((أَمْرُكُمْ بِخُمْسٍ)) کے بعد الفاظ آتے ہیں: ((اللَّهُ أَمَرَنِي  
 بِهِنَّ))<sup>(۲)</sup> ”اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے۔“ اس طرح یہ حکم مزید مؤکد ہو جاتا ہے۔ پس  
 معلوم ہوا کہ اقامت دین کے مرحلے کو طے کرنے کیلئے ٹھیکہ اسلامی اصول سمع و طاعت پر مبنی  
 ایک منظم جماعت ناگزیر ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ جہاد کی میں نے جو سطحیں بیان کی  
 ہیں، اُن سے عہدہ برآ ہونے کیلئے بھی جماعتی زندگی لازم ہے۔ اکیلا شخص معاشرے کے دباؤ  
 نفس کی ترغیبات اور ابلیس لعین کی تحریصات کے مقابلے میں مشکل ہی سے ٹھہر سکتا ہے۔

### انقلابی دعوت و تربیت اور اس کا ذریعہ

انقلابی جدوجہد میں دعوت کے ساتھ تربیت کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کی اہمیت کو اکبر الہ  
 آبادی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس شعر میں بیان کیا ہے۔

(۱) مسند احمد ۴/۱۳۰۔ (۲) سنن الترمذی، ابواب الامثال، باب ما جاء فی مثل  
 الصلاة والصيام والصدقة۔

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے  
 ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!  
 علامہ اقبال نے اکبرالہ آبادی کو اپنا مرشد معنوی مانا ہے۔ اسی حقیقت کو اقبال نے جس  
 طرح ادا کیا ہے اس کی اپنی ایک شان ہے۔ فرمایا ہے:-

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو

پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زہار تو<sup>(۱)</sup>!

اور علامہ کی فارسی شاعری میں یہ مضمون نقطہ عروج پر آتا ہے۔

با نشہ درویشی در ساز و دمام زن!

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!!<sup>(۲)</sup>

یہ تربیت ہے، یہ تزکیہ ہے، یہ تعلق باللہ ہے، یہ رضائے الہی کے حصول کی آرزو اور تمنا  
 ہے۔ ان چیزوں سے وہ اجتماعی طاقت وجود میں آتی ہے جس کو سلطنتِ جم پر دے مارنا ہے  
 جس کو باطل اور طاغوت سے جانکرانا ہے۔

انقلابی عمل کے اگلے تین مراحل وہی ہیں جو بیان ہو چکے ہیں: صبر محض، اقدام اور  
 مسلح تصادم۔ لیکن یہ جو پہلا مرحلہ ہے، جسے انقلابی عمل میں اصل حیثیت و اہمیت اور اولیت  
 حاصل ہوتی ہے، اس کے دو مرحلے وہ ہیں جہاں جہاد قرآن کے ذریعے ہوگا۔ پہلا مرحلہ  
 نظریاتی تصادم اور نظریاتی کشمکش کا ہے اور اس کے لیے بندہ مؤمن کے ہاتھ میں جو تلوار  
 ہے وہ قرآن ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا﴾  
 (فرقان: 52) اس کے ساتھ حکمت بھی ہو۔ فرمایا: ﴿ذَلِكَ مِمَّا أَوْحَى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ  
 الْحِكْمَةِ﴾ (بنی اسرائیل: 39) کہ اس حکمت کے ذریعے دعوت و تبلیغ ہو۔ یہ قرآن  
 موعظہ حسنہ بھی ہے۔ فرمایا: ﴿قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ﴾ (یونس: 57) اسی  
 میں جدال بھی ہے۔ مشرکین، ملحدین، منافقین اور اہل کتاب کے ساتھ مجادلہ کا ذریعہ بھی

(۱) جس سے پناہ نمل سکے۔ (۲) درویشی کے نشے میں زندگی گزار اور اسی پر کار بند رہ۔ جب تو

پختہ ہو جائے تو اپنے آپ کو سلطنت جمشید سے ٹکرا دے۔

یہی قرآن ہے۔ سورۃ النحل کی اس آیت میں یہ تمام طریقے نہایت حسین انداز سے آگئے ہیں: ﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ط﴾ (آیت ۱۲۵) پس قرآن کی تلوار ہاتھ میں لے کر نظریاتی تصادم اور کشمکش کے میدان میں کود پڑو۔ انذار قرآن کے ذریعے سے ہو۔ ارشاد الہی ہے: ﴿وَأَوْحَىٰ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَ كُفْرًا بِهِ وَمَنِ بَلَغَ﴾ (الانعام: ۱۹) تبشیر قرآن کے ذریعے سے ہو۔ میں آپ کو سورۃ مریم کی آیت سنا چکا ہوں جس میں انذار اور تبشیر دونوں کا ذریعہ قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے: ﴿فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لِّذُنَا﴾ میں اپنے اس احساس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ اس ”بہ“ پر ہمارے اکثر اہل علم نے کما حقہ توجہ نہیں دی۔ سورۃ الکہف کی پہلی دو آیات میں بھی نہایت خوبصورت اسلوب سے انذار و تبشیر کے لیے ذریعہ قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَىٰ عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا ۖ قَيِّمًا لِّيُنذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا لِّمَنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا﴾

”کل حمد و ثنا اور شکر و سپاس اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہ رکھی۔ ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے اور ایمان لا کر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے۔“

تذکیر ہو تو قرآن سے ہو۔ فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدَ﴾ (ق) ”پس تم اس قرآن کے ذریعہ سے ہر اُس شخص کو نصیحت کرو جو میری تنبیہ سے ڈرے۔“ معلوم ہوا کہ دعوت و تبلیغ کہہ لیں یا نظریاتی تصادم و کشمکش کہہ لیں اس کا ذریعہ اس کا آلہ قرآن ہے۔ جبکہ ہم نے تو اس قرآن کو وعظ کا ذریعہ بھی نہیں بنایا۔ اقبال نے اس کا مرثیہ کہا ہے۔

واعظِ دستاں زن و افسانہ بند  
معنی او پست و حرفِ او بلند

از خطیب و دیلمی گفتار اُو  
با ضعیف و شاذ و مرسل کار اُو

یعنی واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھتا ہے۔ اس کے الفاظ بھی پرشکوہ اور بلند و بالا ہوتے ہیں لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے۔ اس کا سارا وعظ قرآن کے بجائے خطیب بغدادی اور دیلمی سے ماخوذ ہوتا ہے اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف، شاذ اور مرسل روایات سے رہ گیا ہے۔ ہمارے عام واعظین نہ معلوم کہاں کہاں سے ضعیف حدیثیں لاتے ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ بد قسمتی سے ہمارے دور میں ضعیف حدیثوں کے حوالے سے تبلیغ ایک باقاعدہ ادارے کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ فضائل کے بیان اور نیکیوں کی تلقین کے لیے اولیائے کرام کی غیر مصدقہ کرامات کا ذکر ہے۔ وعظ و نصیحت کے لیے ضعیف بلکہ موضوع حدیثوں کا سہارا ہے، حالانکہ موعظہ حسنہ تو یہ قرآن ہے۔ دل کی کاپاپلٹ دینے کے وصف کا حامل یہ قرآن ہے، لیکن تلقین یہ کی جاتی ہے کہ اس کو سمجھنا بھی مت! تفسیر تو درکنار اس کا ترجمہ بھی نہ پڑھنا! اس کی تو بس تلاوت کر کے ثواب حاصل کر لیا کرو! وعظ و نصیحت کے لیے ضعیف روایات یا بے سرو پا قصے کہانیاں ہیں، جن کو ایک عام معقول انسان کا ذہن بھی قبول نہ کرے اور ان کو تسلیم کرنے پر اس کا دل تیار نہ ہو۔ اس کے ذریعہ سے ابلاغ کیا ہوگا؟

جیسے کہ میں نے عرض کیا، انقلابی عمل میں پہلا مرحلہ دعوت کا ہے، جس کے لیے نظریاتی تصادم میں ہماری تلوار قرآن ہے اگرچہ اس کا حق ادا کرنا اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ)) کی بشارت نبویؐ کو چند سعید روحیں اپنا مقصد زندگی بنائیں۔ اُن کو اس کے لیے زندگیوں لگانی ہوں گی۔

دوسرا مرحلہ ہے تربیت۔ اس کے لیے بھی ہمارے پاس اصل تلوار قرآن ہے۔ ذرا غور تو کیجئے کہ قرآن مدعی ہے اس حقیقت کا کہ ﴿شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ﴾<sup>(۱)</sup> میں

ہوں۔ لیکن ہم نے تزکیہ نفس کے لیے کہاں کہاں بھیک مانگی ہے اور پھر اس کے لیے فلسفے اور پورے پورے نظام مدون کیے ہیں۔ مگر اس کوچے میں گزر نہیں ہے تو قرآن کا نہیں ہے۔ اقبال نے اس کا بھی نوحہ کیا اور مرثیہ کہا ہے۔

صوفی پشینہ پوش حال مست  
از شراب نغمہ قوال مست  
آتش از شعر عراقی در دلش  
در نمی سازد بقرآن محفلش

”پشینہ پوش صوفی اپنے حال میں مست اور قوالی کی شراب سے مدہوش ہے۔ اس کے دل میں عراقی کے شعر سے آگ بھڑک اٹھتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں ہے۔“

اور بالفرض کچھ ہو بھی تو اس کا کوئی اثر نہیں جو مدعی ہے ”شَفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ“ ہونے کا اور جس کے بارے میں اُس کا نازل کرنے والا خود ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَنَزَّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۲)

”ہم اس قرآن کے سلسلہ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو اہل ایمان کے لیے شفا اور رحمت ہے۔“

لیکن اس کی ناقدری کا یہ عالم ہے کہ ہم نے سارے کوچے کھنگال لیے، درد سے بھیک مانگ لی، لیکن یہ دروازہ بند ہے۔ حالانکہ تربیت و تزکیہ بھی اسی قرآن کے ذریعے ہوگا! میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کو بھی اس دور میں اقبال نے خوب پہچانا ہے۔ میں علمائے کرام کی عظمت اور ان کے مقام و مرتبہ کا معترف ہوں، لیکن اس حقیقت کو بیان کیے بغیر بھی چارہ نہیں کہ ان حقائق کا جو انکشاف اقبال پر ہوا ہے اور ان کا جو شعور و ادراک علامہ کو حاصل ہوا ہے وہ مجھے اس دور میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔ کس خوبصورتی سے کہتے ہیں:

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است  
زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است  
خوشتر آں باشد مسلمانِ کنی



کشیۃ شمشیر قرآنش کنی!

”شیطان کو بالکل ہلاک کر دینا بہت مشکل کام ہے۔ اس لیے کہ وہ انسان کے دلوں میں ڈیرا لگاتا ہے اور اس کی رسائی انسان کے دل کی گہرائیوں تک ہے۔ بہتر راستہ یہ ہے کہ اسے قرآن کی حکمت و ہدایت کی شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنالیا جائے۔“

غور کیجئے ہر شعر میں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مفہوم کو کس خوبی سے سمودیا ہے! یہ حدیث نبویؐ گزر چکی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

(( اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرًى الدَّمِ )) (متفق علیہ)

”شیطان انسان کے وجود میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے جیسے کہ خون۔“

پہلے شعر میں اس کا حوالہ ہے۔ دوسرا شعر بھی ایک حدیث نبویؐ سے ماخوذ ہے۔ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے۔ کسی صحابی نے بڑی ہمت اور جرأت کی (اللہ تعالیٰ انہیں اجر دے) وہ دریافت نہ کرتے تو یہ حکمت ہم تک کیسے پہنچتی (انہوں نے سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ کے ساتھ بھی ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا: ”ہاں ہے“ لیکن میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے!“ یہ ہے وہ بات جو دوسرے شعر میں علامہ نے کہی ہے کہ اس قرآن کی شمشیر سے گھائل کر کے شیطان کو مسلمان بنایا جاسکتا ہے۔

اگر ہر ایسا ہے جو پورے وجود میں سرایت کرتا ہے تو یہ قرآن بھی وہ تریاق ہے جو پورے وجود میں سرایت کرتا ہے۔ ظاہر ہے اگر تریاق زہر سے زیادہ مؤثر نہ ہو تو زہر کا اثر کیسے زائل ہوگا! اس بات کو بھی اقبال نے اس طرح کہا ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود

جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

یعنی یہ قرآن جب کسی کے اندر سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب آ جاتا ہے۔ اب وہ انسان بالکل بدلا ہوا انسان بن جاتا ہے۔ یہ باطنی انقلاب ہے اندر کی تبدیلی ہے۔ یہ باطنی انقلاب، یہ اندر کی تبدیلی ایک عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بنتی ہے ورنہ انقلاب کہاں سے آئے گا۔ ”جہاں دیگر شود“ کا اصل مفہوم تو یہ ہوگا کہ جس انسان کے اندر قرآن کے

ذریعے تبدیلی آگئی اس کے لیے جہاں بدل گیا، اس کی دیکھنے والی نگاہ بدل گئی، اس کا زاویہ نظر بدل گیا، اس کی اقدار بدل گئیں۔ اب اس کے لیے یہ جہاں وہ نہیں ہے، بلکہ ”جہانِ نو“ ہو رہا ہے پیدا یہ عالم پیرمر رہا ہے، والا معاملہ ہے۔ جب کسی کے دل میں قرآن اتر جائے تو اس کے لیے اب یہ عالم نیا عالم ہے۔ اس کا نقطہ نظر اور مطلوب و مقصود بدل گیا ہے۔ اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ اگر ایسے فدائین کی ایک منظم جماعت وجود میں آ جائے جن کے دلوں میں قرآن جاگزیں ہو جائے تو یہ تبدیلی عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اندر جوشِ ایمانی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ اسی قرآن کی بدولت ہی پیدا ہوا تھا۔ یہ مختصر سی اور بے سرو سامان جماعت ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں تلوار لے کر کسریٰ و قیصر یعنی وقت کی دو عظیم سلطنتوں سے جا ٹکرائی تھی اور بیس سال کے مختصر عرصہ میں اول الذکر کو بالکل نیست و نابود کر کے رکھ دیا تھا، جبکہ آخر الذکر کو مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ سے بالکلیہ بے دخل کر دیا تھا اور ان علاقوں پر اللہ کے دین کا جھنڈا لہرانے لگا تھا۔

حاصل کلام یہ کہ انقلابی عمل کی دو سطحیں ہیں، یا یوں کہہ لیں کہ جہاد کے دو Levels ہیں۔ مجاہدہ مع النفس کے لیے ہمارا آلہ جہاد قرآن ہے اور نظریاتی کشمکش اور تصادم کے لیے بھی ہماری تلوار قرآن ہے۔

تحدیث بالعمۃ<sup>(۱)</sup> کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اسی جہاد بالقرآن کا عزم لے کر میں ۱۹۶۵ء کے اواخر میں ساہیوال سے لاہور منتقل ہوا تھا، ورنہ ۱۹۵۴ء میں لاہور سے ایم بی بی ایس کر کے میں ساہیوال میں مقیم ہو گیا تھا۔ لاہور آ کر میں نے بالکل تنہا اس کام کو شروع کیا۔ اُس وقت کوئی ساتھی، کوئی ادارہ اور کوئی انجمن نہیں تھی۔ ”میشاق“ کا چارج سنبھالا تو تنہا خود ہی اس کا ایڈیٹر، خود ہی مالک، خود ہی پروف ریڈر، حتیٰ کہ خود ہی اس کا کلرک اور چیپڑ اسی۔ پھر دارالاشاعت الاسلامیہ قائم کیا تو وہ بھی تنہا، وہی ”میشاق“ والی صورت حال تھی۔ ساتھ ہی مولانا حسرت موہانی کے اس مصرع ”ہے مشقِ سخن جاری، پچکی کی مشقت

بھی، کے مصداق مطب بھی کر رہا تھا، نبضیں بھی دیکھ رہا تھا اور نسخے بھی لکھ رہا تھا۔ اسی دوران کئی علاقوں میں مطالعہ قرآن کے حلقے قائم کیے اور منتخب نصاب کا درس شروع کیا۔ قرآن کی دعوت کا یہ اعجاز کہ اعوان و انصار ملتے چلے گئے۔ ۱۹۷۲ء کے اوائل میں میں نے میثاق میں ”مرکزی انجمن خدام القرآن“ اور اس کے زیر انتظام قرآن اکیڈمی کے قیام کا خاکہ پیش کیا۔ الحمد للہ بعض دردمند اور اہل دل حضرات نے اس پر لبیک کہی اور ۱۹۷۲ء کے وسط میں باقاعدہ انجمن قائم ہو گئی۔ میں نے انجمن کے خاکے اور پھر دستور کی تقدیم میں یہ شعر درج کیا تھا۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں!

یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

الحمد للہ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۴ء تک قریباً بارہ سال انجمن کے قیام پر گزر گئے ہیں۔ اس عرصہ میں جو بھی بن پایا ہے اور جس کام کی بھی اللہ کی طرف سے توفیق ملی ہے وہ آپ حضرات کے سامنے ہے۔ انجمن کا قیام اس کے لیے دفاتر، رہائشی کوارٹرز، ہاسٹل، جامع القرآن قرآن اکیڈمی کی تعمیرات، علوم و معارف قرآن کی نشر و اشاعت کے لیے مکتبہ کا قیام و دعوت رجوع الی القرآن کا پیغام پہنچانے کے لیے پاکستان کے دوسرے شہروں کے دورے اور دروس و خطابات کے ذریعے دین کے جامع تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش، قرآن کانفرنسوں اور محاضرات قرآنی کا انعقاد مختلف شہروں میں قرآنی تربیت گاہوں کا انتظام ساتھ ہی اسی پیغام کے لیے بیرون پاکستان کے اسفار میں نے یہ کام صرف اس مقصد کے لیے گنوائے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ ان سب کاموں کو آپ ”جہاد بالقرآن“ کے عنوان کے تحت اپنے حافظے میں درج کر لیں۔

ایک وقت وہ بھی آیا جب خالصتاً اللہ ہی کی طرف سے اس دور کے سب سے موثر ذریعہ ابلاغ ٹیلی ویژن پر پورے پندرہ ماہ تک ”الہدیٰ“ کے نام سے قرآن مجید کا پیغام ملک کے گوشے گوشے تک پہنچا۔ پہلی مرتبہ جب اسلام آباد سے ٹی وی کے ایک پروڈیوسر صاحب مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے دفتر میں رمضان المبارک میں روزانہ

”الکتاب“ کے عنوان سے تقاریر کی تجویز لائے تو اُس وقت انجمن کی مجلس منظمہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر ان سے ملنے گیا۔ انہوں نے کہا کہ پورے رمضان میں روزانہ بارہ منٹ کا ”الکتاب“ کے عنوان سے ایک پروگرام ہوگا، اس میں آپ کو ایک پارے کے بارے میں کچھ بیان کرنا ہوگا۔ میں نے کہا مجھے ایک آیت کے لیے بسا اوقات ایک گھنٹہ درکار ہوتا ہے اور آپ ایک پارے کے لیے مجھے بارہ منٹ عطا کر رہے ہیں، میں اس مختصر سے وقت میں کہوں گا کیا؟ میں نے معذرت کی کہ مجھ میں اس کی نہ صلاحیت ہے اور نہ جرأت۔ آپ کسی اور کو تلاش کیجئے۔ میں دفتر والوں سے یہ کہہ کر کہ ان کی چائے وغیرہ سے تواضع کر کے ان کو رخصت کر دو، انجمن کے اجلاس میں واپس آ گیا۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ کون صاحب تھے؟ کیا معاملہ تھا؟ میں نے جب بتایا تو سب اراکین میرے سر ہو گئے کہ آپ نے یہ کیا کیا، وہ پانچ منٹ بھی دیں تو ضرور لے لیں! وہ اس ذریعہ ابلاغ کی اہمیت سے واقف تھے۔ بہر حال اراکین کے اصرار پر میں دوبارہ اٹھ کر گیا، وہ صاحب ابھی چائے پی رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ساتھیوں کے اصرار پر میں یہ پیشکش منظور کرتا ہوں۔

چنانچہ دو سال رمضان المبارک میں روزانہ ”الکتاب“ کا پروگرام ٹی وی پر نشر ہوا، پھر تیسرے سال رمضان ہی میں ”السم“ سیریز چلی، پھر ”الہدیٰ“ کا ہفتہ وار پروگرام نشر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے یہ راستہ پیدا فرمادیا۔ پھر بالکل درمیان میں ”الہدیٰ“ کا پروگرام ختم ہو گیا۔ درمیان میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ میں اس پروگرام میں ”مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب“ سلسلہ وار بیان کر رہا تھا۔ وہ نصف ہوا تھا کہ اچانک اس پروگرام کو بند کر دیا گیا۔ لیکن میں قطعی مطمئن ہوں کہ یہ اللہ ہی کا فیصلہ ہے اور اس میں یقیناً خیر ہے۔ ارشاد الہی ہے:

﴿وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ

شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۶۰﴾ (البقرة)

”ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ

ایک چیز ہمیں پسند ہو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔“ اس ”الہدیٰ“ کے پروگرام کے ذریعے ملک بھر میں ایک پیاس پیدا ہو گئی۔ لوگوں کی یہی پیاس ہے جو مجھے کھینچ کر جگہ جگہ لے جا رہی ہے اور عرصہ سے صورت حال یہ ہے کہ میں عموماً لاہور سے ہفتہ کی صبح کو نکلتا ہوں اور جمعرات کی رات یا جمعہ کی صبح کو یہاں واپس پہنچتا ہوں۔ اگر آج شہر شہر جا کر میں قرآن کا پیغام پہنچا رہا ہوں تو ظاہر بات ہے کہ اس کے لیے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ”الہدیٰ“ کے پروگرام کو بنایا، ورنہ ہمیں کون جانتا تھا، اور اگر ہم پچاس برس بھی لگے رہتے تو اپنے محدود ذرائع و وسائل سے اتنا وسیع حلقہ تعارف پیدا نہیں ہو سکتا تھا اور معاشرے میں اتنی پیاس پیدا نہیں ہو سکتی تھی جو بظاہر احوال نظر آ رہی ہے۔

بہر کیف میں گفتگو کے اختتام سے قبل عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن ہی ہمارا ذریعہ دعوت ہے۔ نظریاتی تصادم اور کشمکش کے لیے ہماری تلوار قرآن حکیم ہے۔ جہاد بالقرآن ہی ہمارا طریقہ کار ہے۔ نفس اور شیطان سے کشمکش کے لیے بھی ہمارے ہاتھ میں واحد تلوار قرآن مجید ہے۔ تزکیہ نفس کے لیے قرآن نے جو پروگرام دیا ہے اس میں دو مؤثر ترین چیزیں ہیں ایک قیام اللیل، دوسری اس قیام میں ترتیل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قرآن کی تلاوت و قراءت۔ ابتدا میں قیام اللیل کا حکم اطلاقی شان کے ساتھ آیا تھا:

﴿يَا أَيُّهَا الْمَزْمَلُ ۚ قُمْ الْيَلَّ إِلَّا قَلِيلًا ۚ نَّصُفَّهُ أَوْ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۚ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۚ﴾ (المزمل)

”اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے (ﷺ)! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم۔ آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو، اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔“

بعد میں جب اس نے ایک معین شکل اختیار کی تو حکم آیا:

﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (بنی اسرائیل: ۷۹)

”اور رات کو اس (قرآن) کے ساتھ قیام کرو یہ تمہارے لیے نفل ہے۔“

رات کا جاگنا اور مجرد جاگنا نہیں، بلکہ قیام میں قرآن کی طویل قراءت و تلاوت، یہ دو تھنکار ہیں جن سے ایک بندہ مؤمن کی جہاد بالقرآن کے لیے سیرت کی تعمیر ہوتی ہے اور اس

دعوتِ موعظہ اور مجاہدہ میں تائید پیدا ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس قرآن کو ہاتھ میں لے کر ہمیں باطل کے خلاف نبرد آزما ہونے اور خود اپنے شیطان اور اپنے نفس سے لڑنے کے لیے اس قرآن کی تلوار کو استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اَللّٰهُمَّ اَنْسُ وَحُشْتَنَا فِيْ قُبُوْرِنَا، اَللّٰهُمَّ اَرْحَمْنَا بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ، وَاجْعَلْهُ  
لَنَا اِمَامًا وَنُوْرًا وَهَدًى وَرَحْمَةً، اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنَا مِنْهُ مَا نَسِيْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْهُ  
مَا جَهِلْنَا، وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَهُ اَنَاءَ الْيَلِّ وَاَنَاءَ النَّهَارِ وَاجْعَلْهُ لَنَا حُجَّةً يَّوْمَ  
رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝۝

”یا اللہ ہمیں اپنی قبروں میں تنہائی سے مانوس کر دے۔ یا اللہ! ہم پر قرآن عظیم کی بدولت رحم فرما اور اسے ہمارے لئے پیشوا، نور اور ہدایت و رحمت بنا دے۔ پروردگار! اس میں سے جو کچھ ہم بھولے ہوئے ہیں وہ ہمیں یاد کرادے اور جو ہم نہیں جانتے ہمیں سکھا دے۔ اور ہمیں توفیق عطا فرما کہ اس کی تلاوت کریں راتوں کو بھی اور دن کے حصوں میں بھی اور بنا دے اسے دلیل ہمارے حق میں اے تمام جہانوں کے پروردگار!“ (آمین)



# جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ

الحمد لله وكفى والصلوة والسلام على عباده الذين اصطفى خصوصا على افضلهم  
سيد المرسلين خاتم النبيين محمد الامين وعلى آله واصحابه اجمعين ..... أما بعد:  
فاعوذ بالله من الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿تَبَرَّكَ الَّذِي نَزَلَ الْفُرْقَانُ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا﴾<sup>(۱)</sup>

﴿وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا﴾<sup>(۲)</sup>

﴿فَلَا تُطِيعِ الْكُفْرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا﴾<sup>(۳)</sup> (الفرقان)

﴿وَاَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ (آل عمران: ۱۰۳)

صدق الله العظيم

خطبہ مسنونہ: تلاوت آیات اور ادعیہ مانور کے بعد:

میں نے جہاں تک غور کیا ہے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہماری دینی، ملی، قومی اور معاشرتی زندگی میں اس وقت پانچ محاذ ایسے ہیں جو جہاد بالقرآن کے شدید طور پر متقاضی ہیں— رہا مسلمانوں سے باہر کا دائرہ تو وہ ابھی بڑی دُور کی بات ہے۔ پہلا مسئلہ تو "Physician heals thyself"<sup>(۱)</sup> کے مصداق خود اپنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو پوری نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لیے برپا فرمایا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران: 110) ”تم وہ بہترین امت ہو جس کو نوع انسانی کے لیے نکالا گیا ہے“۔ دنیا کی دوسری قومیں اپنے لیے جیتی ہیں لیکن تمہیں ان کے لیے جینا ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے

کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے؟

ہماری مثال تو اس ساقی کی سی ہے جس کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا جام ہدایت تھما دیا ہے

(۱) طبیب خود اپنے آپ کو صحت یاب کرتا ہے۔

اور ایک ایک فردِ نوع بشر کو اس سے سیراب کرنا ہماری ذمہ داری ٹھہرائی ہے۔ لیکن میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ تو بہت دور کی بات ہے۔ اس وقت یہ خیر امت اور امت وسط خود کئی طرح کے ذہنی، فکری، اعتقادی، نفسیاتی، جذباتی اور عملی انتشار سے دوچار ہے اور اسے مختلف روگ لگ گئے ہیں۔ یہ اس وقت نہایت مہلک اور مُزمن<sup>(۱)</sup> امراض میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اور یہ کوئی دو چار برس کی بات نہیں ہے ہمارا یہ زوال و انحطاط<sup>(۲)</sup> صدیوں پر پھیلا ہوا ایک عمل ہے۔

لہذا پہلی اور مقدم ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی ملت اور معاشرے کے دائرے کے اندر جائزہ لیں کہ اس وقت وہ کون کون سے فکری، نظریاتی اور عملی محاذ ہیں جن پر ہمیں قرآن مجید کی شمشیر بُراں<sup>(۳)</sup> کو ہاتھ میں لے کر صف آراء ہونا ہے اور ان کے بارے میں ہمیں قرآن مجید اور سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے کیا بنیادی و اساسی ہدایات ملتی ہیں۔ نیز ان ہدایات کے انطباق کے عملی طریقے اور تقاضے کیا ہیں؟ اس مسئلہ پر غور و فکر کے نتیجے میں اس وقت پانچ محاذ میرے سامنے آئے ہیں۔

## محاذِ اوّل

### جاہلیّتِ قدیمہ

اس ضمن میں سب سے بڑا محاذ جاہلیّتِ قدیمہ کا ہے۔ بڑا اس اعتبار سے کہ یہ ہمارے عوام کی اکثریت کا معاملہ ہے۔ عوام الناس کی بڑی عظیم اکثریت کے اندر جاہلیّتِ قدیمہ رچی بسی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ جاہلیّتِ قدیمہ کی اس اصطلاح کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ قرآن مجید اور احادیث شریفہ کی رو سے اسلام سے پہلے کے دور کو ”دورِ جاہلیّت“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس اصطلاح کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی حقانیت، صداقت اور ہدایت کے برعکس جو کچھ بھی پہلے تھا اور جو کچھ اب ہے وہ ”جاہلیّت“ ہے۔

جاہلیّت کو جہالت کے معنوں میں مت لیجیے گا، یہ غلط مُجَث<sup>(۴)</sup> ہو جائے گا۔ ویسے جہالت کے بھی عربی میں وہ معنی نہیں ہیں جو ہم اُردو میں استعمال کرتے ہیں۔ اُردو میں ہم



اُن پڑھ انسان کو جاہل کہتے ہیں، یعنی عالم کے مقابلے میں اُردو میں جاہل کا لفظ مستعمل ہے، جبکہ عربی میں جاہل کا لفظ حلیم کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔ ایک وہ انسان ہے جو بردبار ہے صاحب عقل ہے، غور و فکر کرتا ہے، محض جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا، بلکہ عقل کی رہنمائی میں فیصلے کرتا ہے اور اسی کے مطابق اپنی زندگی کا رخ متعین کرتا ہے۔ عقلی دلیل کی بنیاد پر کسی بات کو قبول یا مسترد کرتا ہے۔ یہ ہے حلیم انسان۔ اور ایک شخص وہ ہے جو جذباتی ہے، اکھڑے، غیر مہذب ہے، ناشائستہ ہے، شہوات و جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے۔ اس کی عقل پر تعصبات و خواہشات کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا شخص پی ایچ ڈی ہو، بہت تعلیم یافتہ انسان ہو، لیکن اسلام کی رو سے یہ شخص جاہل ہے۔ جاہل سے ”جہالت“ بنے گا، لیکن اسی لفظ جہل سے ”جاہلیت“ کی اصطلاح بنتی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام کے ماوراء اور اسلام کے سوا جو کچھ ہے اور جو کچھ تھا!

### جاہلیتِ قدیمہ کے اجزائے ترکیبی

اس جاہلیت کو میں اس وقت دو حصوں میں تقسیم کر کے آپ حضرات کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ ایک جاہلیتِ قدیمہ ہے۔ یہ وہ جاہلیت ہے جو عرب معاشرے میں اُس وقت نہایت غالب عنصر کی حیثیت سے موجود تھی جس وقت نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی تھی۔ یہ جاہلیتِ قدیمہ دو چیزوں سے مرکب تھی۔ ایک شرک، یعنی مشرکانہ اوہام، جو توحید کی ضد ہے۔ اور دوسرے ”شفاعتِ باطلہ“ کا تصور و عقیدہ، جو ایمان بالآخرۃ کی ضد ہے۔

جاہلیتِ قدیمہ میں اللہ کا انکار نہیں تھا۔ مشرکین مَلَّہ اللہ کو مانتے تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والا شخص جو گاہ بگاہ بھی ترجمہ دیکھ لیتا ہے اُس پر یہ حقیقت روشن ہوگی کہ قرآن نے متعدد بار یہ بات کہی ہے کہ اے نبی! اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو یہ لوگ فوراً پکار اٹھیں گے کہ اللہ نے! <sup>(۱)</sup> اور اے نبی! اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان سے بارش کون برساتا ہے اور اس کے ذریعے سے مردہ زمین سے نباتات

(۱) ﴿وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (لقمان: ۲۵)

کون اُگاتا ہے تو فوراً کہیں گے کہ اللہ! <sup>(۱)</sup>۔ تو وہ اللہ کے منکر نہیں تھے۔ البتہ انہوں نے اللہ کے ساتھ دیگر معبودوں کی ایک فوج تصنیف کر رکھی تھی۔ کہیں وہ اللہ کے ساتھ جنات کو پوجتے تھے کہیں انہوں نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دے کر ان کے نام پر دیویاں تراش لی تھیں اور ان کے لیے استھان <sup>(۲)</sup> بنا لیے تھے جہاں وہ چڑھاوے چڑھاتے تھے وہاں جا کر منتیں مانتے تھے اور دعائیں کیا کرتے تھے۔ یہ تھا ان کا شرک! یہ شرک آج بھی آپ کو اپنے عوام میں بھام و کمال ملے گا، ایک شوشے کا فرق نہیں ہے۔ اس شرک نے صرف ہیئت بدل لی ہے کہ آج پتھر کی بنی ہوئی مورتیاں سامنے نہیں رکھی جاتی ہیں، لیکن قبروں کے ساتھ وہی معاملہ ہو رہا ہے جو اُس دور میں بتوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ سرمو <sup>(۳)</sup> فرق نہیں۔ عرسوں کے نام سے یہ جو بڑے بڑے میلے ہوتے ہیں ذرا ان میں جا کر دیکھئے کہ وہاں کیا ہوتا ہے! میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ نے عرب کے دورِ جاہلیت کے میلوں کی رودادیں پڑھی ہوں تو وہ شاید ان سے کہیں پیچھے رہ جائیں۔ تو اس جاہلیتِ قدیمہ کا ایک جزو تو یہ شرک ہے!

جاہلیتِ قدیمہ کا دوسرا جزو شفاعتِ باطلہ کا عقیدہ و تصور ہے۔ جب ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ تم مانتے ہو کہ اللہ ہی خالق ہے، اللہ ہی مالک ہے، اُسی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے، اُسی نے سورج اور چاند کو مخر کر رکھا ہے تو ﴿فَإِنِّي تُوفِّكُونُ﴾ <sup>(۴)</sup> اور ﴿فَإِنِّي تُصَرِّفُونُ﴾ <sup>(۵)</sup> یہ سب کچھ مان کر کہاں سے اندھے ہوئے جا رہے ہو؟ کہاں سے پھر اُئے جا رہے ہو؟ کہاں سے تمہیں اُچکا جا رہا ہے؟ تمہاری مت کیوں ماری جا رہی ہے؟ اس کے جواب میں قرآن مجید نے ان کے متعدد اقوال نقل کیے ہیں۔ سورہ یونس میں ان کا یہ قول نقل ہوا: ﴿وَيَقُولُونَ هُوَ إِلَّا شَفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ﴾ (آیت ۱۸) کہ ہم ان بتوں کو خالق اور مالک تو نہیں مانتے، لیکن ہم کچھ برگزیدہ ہستیاں ضرور مانتے ہیں جن کے نام پر ہم نے یہ بت بنا

(۱) ﴿وَلَكِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللَّهُ﴾

(العنکبوت: ۲۳) (۲) مقامِ مسکن (۳) معمولی

(۴) ﴿ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ فَإِنِّي تُوفِّكُونُ﴾ (غافر)

(۵) ﴿ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ فَإِنِّي تُصَرِّفُونُ﴾ (الزمر)

لیے ہیں۔ یہ ہستیاں مقربین بارگاہ رب العزت ہیں۔ یہ اللہ کے لاڈ لے اور چہیتے ہیں۔ فرشتے جن کو ہم نے دیوایاں بنایا ہے، یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، اور بیٹیاں بہت لاڈلی ہوتی ہیں، کوئی لاڈلی بیٹی اگر فرمائش کرے تو کوئی باپ اس کی فرمائش کو رد نہیں کرتا۔ لہذا ہم جو ان بچوں کو پوجتے ہیں تو صرف اس لیے کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی بنیں گے، ہماری شفاعت کریں گے اور وہاں ہمیں چھڑوالیس گے۔ گویا اللہ کے عدل و انصاف کے آگے یہ روک بن جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الزمر کی تیسری آیت میں ان کے اس باطل عقیدے کا ذکر فرما کر اس کی قطعی طور پر نفی فرمادی۔ وہاں ارشاد ہوتا ہے:

﴿أَلِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ ۚ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۚ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ ۝﴾

”آگاہ رہو کہ دین خالص اللہ ہی کا حق ہے (ہر نوع کی عبادت و اطاعت کا سزاوار اور مستوجب و مستحق صرف اللہ ہے)۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے اس کے سوا دوسروں کو اپنا پشت پناہ اور مددگار بنا رکھا ہے (اس یقین کے ساتھ) کہ ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرادیں (وہ اللہ کے ہاں ہمارے اور اُس کے درمیان عفو و مغفرت کا واسطہ اور ذریعہ بن جائیں اور ہمیں اس کا قرب دلا دیں۔ اے نبی، ان کو متنبہ کر دیجیے کہ) اللہ اُن کے درمیان ان تمام باتوں کا (آخرت میں) فیصلہ فرمادے گا جن میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا، منکر حق اور ناشکر اہو“۔

تو وہ لوگ آخرت کے منکر نہیں تھے البتہ آخرت میں محاسبہ سے محفوظ رہنے کے لیے شفاعتِ باطلہ کا تصور رکھتے تھے۔

یہ دو چیزیں یعنی شرک اور شفاعتِ باطلہ کا عقیدہ اصلاً تو ایک ہی ہے۔ انہیں تصویر کے دو رخ کہہ لیجیے۔ میں نے بغرض تفہیم انہیں علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے کہ جاہلیتِ قدیمہ ان دو اجزاء سے مرکب تھی۔ قرآن مجید میں اس جاہلیتِ قدیمہ کا ذکر نہایت جلی انداز میں ہے۔ چونکہ اُس دور میں یہی شرک غالب تھا اور اصل گمراہی یہی تھی، لہذا اکی سورتوں کا سب

سے بڑا مضمون یہی ہے۔ اور جن حضرات کو بھی قرآن مجید سے شغف<sup>(۱)</sup> ہے وہ اس بات کو جانتے ہوں گے کہ قرآن مجید کا دو تہائی حصہ کی سورتوں پر مشتمل ہے۔ قرآن حکیم میں بار بار مختلف پیرایوں اور مختلف اسالیب میں مختلف انداز سے اس شرک اور شفاعتِ باطلہ کے عقیدے کی تردید کی گئی ہے۔ کہیں تمثیلات کے انداز میں سمجھایا جا رہا ہے، کہیں عقلی دلائل کے ذریعے سے جھنجھوڑا جا رہا ہے، کہیں ان ہی کے موقف سے اُن پر حجت قائم کی جا رہی ہے۔ سورۃ الکہف میں تشریف الآیات کے متعلق جو الفاظ آئے ہیں: ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ﴾ (آیت ۵۴) اور ذرا سی ترتیب کی تبدیلی کے ساتھ یہی بات سورۃ الاسراء میں بایں الفاظ آتی ہے: ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ﴾ (آیت ۸۹)۔ یہ الفاظ اس بات کے اظہار کے لیے آئے ہیں کہ ہم نے کوئی طرزِ اسلوب اور کوئی اندازِ بیان چھوڑا نہیں ہے کہ جس کے ذریعے اس ضلالت و گمراہی کی نفی نہ کر دی ہو اور اس کا ابطال<sup>(۲)</sup> نہ کر دیا ہو۔ آج اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر اپنے معاشرے کا تنقیدی جائزہ لے تو اسے صاف نظر آ جائے گا کہ ہمارے معاشرے کی عظیم اکثریت بھی انہی دونوں گمراہیوں میں مبتلا ہے۔ اس عظیم اکثریت کا دین اولیاءِ پرستی، عرس میلے اور تعزیہ پرستی کا دین ہے، قبروں پر حاضری اور وہاں چڑھاوے چڑھانے، منین ماننے اور دعائیں مانگنے کا دین ہے۔ نماز روزہ تو اس دین میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ اگر ہو جائے تو بڑی بات ہے ورنہ یہ اس عوامی دین کے لزوم میں داخل نہیں۔ یہ اکثریت اس وہم میں مبتلا ہے کہ یہ اولیاءِ کرام جن کی قبروں پر ہم نذر و نیاز چڑھاتے ہیں آخرت میں ہمارے سفارشی بن جائیں گے اور پھر ہمارے سب سے بڑے شفیع خود رسول اللہ ﷺ ہوں گے جن کے ہم نام لیوا ہیں۔ چنانچہ کسی محاسبہٴ خروید کے خوف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

### جاہلیتِ قدیمہ کے خلاف قرآن کی تلوار کا استعمال

پہلا محاذ یہ جاہلیتِ قدیمہ ہے جس کے خلاف ہمیں تلوار اٹھانی ہوگی۔ لیکن تلوار کون

سی؟ قرآن کی تلوار!..... اس محاذ پر ابلیس کے اس فریب و اغوا<sup>(۱)</sup> کے لیے قرآن ہی تلوار کا کام دے گا۔ میں اس موضوع پر علامہ اقبال کے یہ اشعار بار بار آپ کو سنا چکا ہوں جن میں درحقیقت دو احادیث کی ترجمانی کی گئی ہے۔

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است  
خوشر آں باشد مسلمانِ کئی! کشتہ شمشیر قرآنِ کئی!  
میں سمجھتا ہوں کہ اس جاہلیتِ قدیمہ کے محاذ کے لیے کسی دقیق<sup>(۲)</sup> یا بھاری بھر کم علمی منصوبے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر صرف دورہ ترجمہ قرآن کی مہم ہمارے معاشرے میں چل جائے تو وہ لوگوں کے عقائد کی تطہیر کے لیے کافی ہو جائے۔ اس کے لیے دقیق و عمیق<sup>(۳)</sup> تفاسیر کی ضرورت نہیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے یہاں ایک کام عظیم پیمانے پر ہو رہا ہے، لیکن کاش کہ وہ کام فضائل سے متعلق ضعیف و شاذ<sup>(۴)</sup> روایات سے بلند تر ہو اور اس کا تعلق ترجمہ قرآن کے ساتھ قائم ہو جائے کہ ہر مسجد میں فرض نمازوں کے بعد لوگ جمع ہو جائیں اور قرآن حکیم کے متن کے ساتھ کوئی مستند ترجمہ لوگوں کو سنایا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ (ان شاء اللہ العزیز) قرآن مجید کے متن کے ساتھ مجرد ترجمہ اس جاہلیتِ قدیمہ کا قلع قمع کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ اس کے لیے قرآن حکیم کی حکمت کے اٹھارہ<sup>(۵)</sup> سمندر میں غوطہ زنی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لیے میں مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر سمندر میں کہیں تیل گر جائے فرض کریں کہ تیل کا کوئی ٹینکر پھٹ جائے تو تیل سطحِ سمندر کے اوپر ہی رہتا ہے۔ بالکل اسی طریقے سے قرآن مجید میں جاہلیتِ قدیمہ کا جواب ابطال اور اس کی جو تردید ہے اور تو حید خالص کی جو دعوت اور اس کے لیے جو استدلال ہے وہ بالکل سطح پر ہے سامنے موجود ہے۔ اس کے لیے گہرائی میں اترنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تو یہ بات جان لیجیے کہ اس محاذ پر جب تک قرآن مجید کے ساتھ جہاد نہیں ہوگا تب تک مشرکانہ اوہام اور شفاعتِ باطلہ کے عقیدے کی تردید ممکن نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ہمارے یہاں فرقہ وارانہ انداز سے ان عقائد کے حاملین پر جو تنقیدیں ہوتی ہیں اور جس انداز سے

(۱) بہکانہ (۲) باریک (۳) گہری (۴) انوکھی (۵) بہت گہرا

ان کی نفی کی جاتی ہے، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس طرح تو ضد اور ہٹ دھرمی میں اضافہ ہوتا ہے اور کدورت<sup>(۱)</sup> اور تلخی مزید پختہ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ پھر وہاں معاملہ آجاتا ہے فرقہ وارانہ عصبیت اور فرقہ وارانہ مفادات کا۔ چنانچہ اس رنگ اور اس انداز میں تردید کرنا اور چند مخصوص چیزوں کو نشانہ بنا کر انہی پر مسلسل گولہ باری کرتے چلے جانا، اس سے کچھ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ قرآن مجید نے اس مسئلہ کا جو "Panoramic"<sup>(۲)</sup> View لیا ہے اور اسے اس کے وسیع پس منظر میں جس قابل فہم اور فصیح و بلیغ انداز اور بدیہیات<sup>(۳)</sup> فطرت کے تاروں کو چھیڑنے والے اسلوب میں بیان کیا ہے اس کے مقابل میں کون مسلمان یہ گمان کر سکتا ہے کہ وہ اس سے بہتر اور دلنشین انداز اور ناقابل تردید دلائل اختیار کر سکتا ہے؟ اور اگر یہ گمان کرے تو کیا اس کا ایمان سلامت رہ جائے گا؟ معاذ اللہ! کیا کوئی مسلمان بقائمی ہوش و حواس یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کا بیان کردہ فلسفہ اور اس کے پیش کردہ دلائل قرآن حکیم کی حکمت اور آیاتِ بینات<sup>(۴)</sup> سے زیادہ محکم اور روشن ہیں؟ معاذ اللہ! ثم معاذ اللہ!..... آیاتِ بینات تو وہ ہیں جن کے متعلق سورۃ الحدید میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ بِكُمْ لَكَرِيمٌ ۝﴾

”وہی (اللہ تبارک و تعالیٰ) تو ہے جو اپنے بندے (محمد رسول اللہ ﷺ) پر روشن اور واضح آیات نازل فرما رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔“

رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور قرآن حکیم کا نزول اُس کی شانِ رافت اور شانِ رحمانیت و رحیمیت کے مظاہر اتم ہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿الْكَرِّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ۝﴾ (الرحمن)

پس اگر ملک گیر پیمانے پر قرآن مجید کے ترجمے کی مہم شروع ہو جائے تو میرے نزدیک یہ ہے پہلے محاذ کے روگ کا مداوا<sup>(۵)</sup>۔ میں نے اس کو نمبر ایک پر اس لیے رکھا ہے کہ عدوی اعتبار سے ہماری ملت اور ہماری قوم کی عظیم ترین اکثریت درحقیقت اسی جاہلیت

قدیمہ کا شکار ہے۔

## محاذ دوم

### جاہلیت جدیدہ

جہاد بالقرآن کا دوسرا محاذ جاہلیت جدیدہ کے خلاف ہے۔ جاہلیت جدیدہ الحاد و مادہ پرستی کا دوسرا نام ہے۔ اس میں اللہ کا انکار بھی ہے اور بعث بعد الموت کا بھی۔ اس میں مادے (matter) سے ماوراء کسی شے کو تسلیم کرنے سے اعراض اور احتراز ہے۔ اسی جاہلیت جدیدہ کے لیے میں طبعیاتی عقل پرستی یا Scientific Rationalism کا لفظ بھی استعمال کیا کرتا ہوں۔

جدید دور کی اس جاہلیت کی عمر قریباً تین سو برس ہے۔ یورپ کے دو ممالک فرانس اور جرمنی میں دو تحریکیں بیک وقت شروع ہوئی تھیں: ایک تحریک اصلاح مذہب (Reformation) اور دوسری تحریک احیاء العلوم (Renaissance)۔ بد قسمتی سے اُس وقت یورپ میں عیسائیت کے نام سے جو مذہب تھا وہ نہایت ظالمانہ و جابرانہ اور انتہائی غیر معقول اور بعید از انصاف نظام کا حامل تھا۔ اس میں ملوکیت (Monarchy) اور پاپائیت (Theocracy) کا گٹھ جوڑ تھا۔ اس کی وجہ سے لوگوں میں رد عمل کے طور پر مذہب سے ایک نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اس پس منظر اور اس فضا میں جب سائنس کی ترقی شروع ہوئی تو سائنس کی جڑوں میں الحاد پیوست ہو گیا اور سائنسی نقطہ نظر یہ بن گیا کہ جو چیز (verifiable)<sup>(۱)</sup> نہیں ہے، جس کی ہم توثیق یا تردید نہیں کر سکتے، اس کی طرف کوئی توجہ نہیں ہونی چاہیے یہ چیزیں لائق اعتناء نہیں ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ ہم یقین کے ساتھ یہ جان سکیں کہ اللہ موجود ہے یا نہیں ہے، تو اس پر ایمان چہ معنی دارد<sup>(۲)</sup>! اسی طرح ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہ ہم کہہ سکیں کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے یا

(۱) قابل تصدیق (۲) کیا معنی رکھتا ہے؟

نہیں ہے۔ اس کا ہمارے پاس نہ کوئی سائنسی ثبوت ہے اور نہ کسی نے موت کی سرحد پار کرنے کے بعد پھر واپس آ کر ہمیں خبر دی ہے۔ لہذا اس کو چھوڑیے، یہ خواہ مخواہ کے ڈھکوسلے ہیں۔ کوئی اسے "Dogma" کے طور پر مانتا ہے تو مانتا رہے، لیکن یہ کوئی قابل توجہ مسئلہ نہیں ہے۔ اسی طریقے سے کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ ہمارے جسم میں جو جان (life) ہے، اس کے علاوہ روح نام کی بھی کوئی شے ہے۔ اس کی آج تک کوئی توثیق (verification) نہیں ہو سکی، لہذا اس مسئلہ کو چھوڑو۔ معقول طرزِ عمل یہی ہے کہ جو چیزیں موجود ہیں، ٹھوس ہیں، قابل تصدیق ہیں، ہمارے حواسِ خمسہ کے دائرے میں آتی ہیں ان ہی پر توجہ مرکوز رکھو۔ لہذا طبیعیاتی عقل پرستی کا فارمولا یہ بنا کہ چونکہ اللہ ایک خیالی و تصوراتی چیز ہے جب کہ کائنات ایک حقیقت ہے، روح بھی ایک تصوراتی چیز ہے جب کہ مادہ اور جسم ایک ٹھوس حقیقت ہے، اور حیاتِ اخروی بھی اسی قبیل<sup>(۱)</sup> کی شے ہے جب کہ حیاتِ دنیوی ایک حقیقت ہے اور اس سے ہر وقت ہر لمحہ اور ہر لحظہ سابقہ ہے، لہذا ماورائے حواس اور خیالی و تصوراتی باتوں پر غور کرنا وقت کا زیاں ہے۔ اس کے بجائے ہماری توجہات کا ارتکاز ان چیزوں پر ہونا چاہیے جو ٹھوس ہیں، نگاہوں کے سامنے ہیں، حواس کی گرفت میں آنے والی ہیں، قابل توثیق ہیں اور جن سے ہمیں ہر دم واسطہ پڑتا ہے۔ یہ ہے اصل میں اس دور کی جاہلیت، یعنی جاہلیتِ جدیدہ کا صغریٰ کبریٰ۔

### جاہلیتِ جدیدہ کا ذکر قرآن میں

اس موقع پر میں آپ سے یہ عرض کر دوں کہ یہ نہ سمجھئے کہ یہ بالکل نئی جاہلیت ہے۔ دے دے انداز میں ایک محدود پیمانے پر الحاد و مادہ پرستی پر مشتمل یہ جاہلیت، جس کے لیے موزوں ترین لفظ ”دہریت“ استعمال کیا جاسکتا ہے، بعثتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے وقت بھی موجود تھی۔ میں حیران ہوں کہ قرآن مجید میں ایک ہی جملہ میں اُس قلیل گروہ کے فلسفہ دہریت کو اس طور سے بیان کر دیا گیا ہے کہ دورِ جدید کی ہر نوع کی جاہلیت اور



دہریت کی طرف بھی اس میں واضح اشارات موجود ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ قرآن کلام الہی ہے جس کے متعلق نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس میں پچھلے زمانے کی خبریں بھی ہیں اور آنے والے زمانے کی بھی۔ تو قرآن کا یہ ایک جملہ دہریت و الحاد کے تمام مکاتب فکر کی نمائندگی کرتا ہے:

﴿وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ﴾ (الجمہ: ۲۴) اس مکتب فکر کا قول نقل فرمایا گیا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی تو بس ہماری یہی دنیا کی زندگی ہے۔ یعنی ہم نہیں مانتے کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے۔ پھر یہ کہ ایسی کوئی بالاتر طاقت یا ہستی نہیں ہے جس کے فیصلے سے ہمارا یہ مرنا اور جینا ہو رہا ہو۔ ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی زندہ ہوتے ہیں..... جبکہ قرآن مجید میں اس کے بالکل برعکس حقیقت بیان ہوتی ہے: ﴿يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾ ”وہ (اللہ) ہی زندہ رکھتا ہے اور وہی موت دیتا ہے“۔ یہ کارگاہ موت و حیات اُسی کی تخلیق ہے۔ ﴿الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ﴾ ”وہی ہے جس نے موت اور زندگی کی تخلیق فرمائی“۔ لیکن یہاں نسبت اپنی طرف ہے: ﴿نَمُوتُ وَنَحْيَا﴾ ”ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی جیتے ہیں“۔ ﴿وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ﴾ ”اور ہمیں ہلاک کرنے والی چیز بھی سوائے گردشِ افلاک کے اور کچھ نہیں“۔ ایک نظام رواں دواں ہے۔ کچھ قوانین طبعیہ (Laws of Nature) ہیں جن کے تحت اس کائنات کا کارخانہ چل رہا ہے۔ لوگ پیدا ہوتے ہیں، جیتے ہیں، مرتے ہیں۔ کسی بالاتر طاقت اور موت کے بعد دوبارہ وجود اور کسی دوسری زندگی کو ہم نہیں مانتے.....!

بتائیے کہ اس دور کی جدید جاہلیت اس سے آگے اور کہاں جائے گی؟ بلکہ آج کے دور کے سائنٹفک ذہن رکھنے والے لوگ تو پھر بھی محتاط الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ باتیں حقیقت رکھتی ہیں یا نہیں! ہم کوئی حتمی حکم نہیں لگا سکتے کہ اللہ ہے یا نہیں! آخرت ہے یا نہیں! اس طرح سے وہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ برٹریڈ رسل اس دور کے عظیم ترین اور نہایت مسلمہ فلسفیوں میں سے تھا اور اس نے الحاد و مادیت اور دہریت کے فلسفے کا پرچار اور

اللہ آخرت، روح اور اخلاق کا ابطال جس بڑے پیمانے پر اور جس مقبول عام اور دلنشین اسلوب و انداز سے کیا ہے اس کا صحیح اندازہ ہم کو نہیں ہے۔ اس نے ہماری نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اکثریت کے اذہان کو مغلوب کر رکھا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی سورۃ الجاثیہ کی ایک آیت کے ابتدائی حصے کے حوالے سے بیان کیا ہے اس نوع کی جاہلیت کے جراثیم اگرچہ وہاں بھی موجود تھے لیکن اُس دور میں ایسے مسخ شدہ ذہنیت والے دانشور آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ وہاں جو غالب جاہلیت تھی اسے میں جاہلیت قدیمہ کے ضمن میں بیان کر چکا ہوں۔ یعنی اللہ کو ماننے کے ساتھ جھوٹے معبودوں کا اقرار اور اُن کی پوجا پاٹ اور آخرت کو ماننے کے ساتھ شفاعتِ باطلہ کا تصور و عقیدہ۔ جس پر قرآن میں نہایت واضح اور نمایاں انداز میں بحث کر کے اُس کا پوری طرح سے ابطال کیا گیا ہے۔ البتہ جاہلیتِ جدیدہ کا معاملہ چونکہ وہاں بہت کم تھا لہذا اس پر قرآن مجید میں بحث اس انداز میں نہیں ہے جس طرح جاہلیتِ قدیمہ کے ضمن میں کی گئی ہے۔ لیکن اس معاملے میں بھی قرآن حکیم بھرپور رہنمائی فراہم کرتا ہے اور یہ رہنمائی اُن باصلاحیت باہمت اور ذہین لوگوں کیلئے ہے جو کمر کس لیں اور پھر قرآن حکیم کی آیاتِ بینات میں غوطہ زنی کریں اور جدید اسلوب و انداز کے ساتھ اس کا ابلاغ و اعلام کریں۔ اس لیے کہ زمانہ اور اس کے تقاضے بدل گئے ہیں جن اصطلاحات میں لوگ بات سمجھتے ہیں وہ اصطلاحات بدل گئی ہیں۔ اگر آپ بہترین اور مُسکِت<sup>(۱)</sup> بات کہیں گے لیکن قدیم اصطلاحات میں کہیں گے تو یہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کیلئے استدلال آپ کو جدید اصطلاحات میں ڈھال کر پیش کرنا ہوگا۔ پھر یہ کہ اس جاہلیتِ جدیدہ کیلئے اس دور میں جو عقلی مواد فراہم کیا گیا ہے اس کے ابطال کیلئے آپ کو عقلی دلائل لانے ہوں گے۔ اگرچہ ان تمام کاموں کیلئے اصل تلوار قرآن ہی کی استعمال ہوگی لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اس میدان میں سخت محنت کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لیے قرآن حکیم میں غوطہ زنی کرنی ہوگی جس کے لیے کچھ نوجوانوں کو اپنی پوری زندگی وقف کرنی ہوں گی۔

## جاہلیتِ جدیدہ کے لامحدود گوشے

جاہلیتِ قدیمہ کے برعکس جاہلیتِ جدیدہ کئی گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ بے خدا سائنس اور فکر و فلسفہ کی جولانگاہیں<sup>(۱)</sup> لامحدود ہیں۔ اس دور میں علم الحیاتیات اور علم الحیوانات کی طرح کی "Physical Sciences" بھی ہیں، پھر "Social Sciences" بھی ہیں، جن کا دائرہ کار وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے۔ اور یہ بات جان لیجیے کہ ڈارون کا فلسفہ ارتقاء اب صرف حیاتیات کے میدان تک محدود نہیں رہا ہے، اس نے انسان کی معاشرتی اقدار اور تمدنی و تہذیبی فکر، حتیٰ کہ فلسفہ اخلاقیات تک کو تپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ اور یہ فلسفہ انسان کو محض ایک ترقی یافتہ حیوان کی سطح پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اس فلسفہ نے حیوانی شہوات و داعیات کی تسکین کے لیے انسان کو حیوانات کی طرح کھلا لائسنس دے دیا ہے۔ چنانچہ ہمیں اس زہر کا تریاق فراہم کرنا ہوگا۔ پھر ماہرین نفسیات نے نفسیات (Psychology) کے میدان میں جو گل کھلائے ہیں اور جس طرح کی گرہیاں پھیلانی ہیں، ان سب کا ابطال کرنا ہوگا۔ اس میدان میں سب سے بڑی گرہی فراہم کی پیدا کردہ ہے جس نے انسان کے تمام محرکاتِ عمل کو جنسی جذبے کے تابع قرار دے دیا ہے۔ اسی طرح عمرانیات (Sociology) کے میدان میں جو بھی باطل اور گمراہ کن نظریات درآئے ہیں، ان سب کا توڑ کرنا ہوگا۔

مارکسزم (Marxism) اس دور کا سب سے مقبول فکر ہے جس کا صرف اذہان ہی پر نہیں، بلکہ دنیا کے قابل ذکر ممالک پر عملاً اس نظامِ فکر کا استیلاء<sup>(۲)</sup> و تسلط ہے۔ مارکسزم اور کمیونزم کے متعلق یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ مادیت ہی کا نقطہ عروج ہے۔ مادیت (Materialism) ہی اپنی انتہا کو پہنچ کر جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اور جیسے ڈارون کے نظریے نے اخلاقیات، معاشرت اور عمرانیات میں نفوذ کر رکھا ہے، اسی طرح مارکسزم کے نظریے نے انسان کی اخلاقی قدروں اور انسانی تہذیب کے تصورات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس نے دین و مذہب کے عقائد کی بنیادیں ڈھا

کر رکھ دی ہیں اور اپنے ماننے والوں کو مکمل طور پر دہریہ و ملحد بنا کر رکھ دیا ہے۔ انسان کے ماورائی عقائد اور اخلاقی قدریں اس فکر و نظریہ کے تحت آ کر بالکل نیا رخ اختیار کر گئی ہیں۔ الغرض اس تیسرے محاذ یعنی جاہلیتِ جدیدہ کی کوکھ سے بہت سے فتنے جنم لے چکے ہیں۔ ان سب کے خلاف محاذ آرائی کرنی ہوگی۔ اس جاہلیتِ جدیدہ کے ابطال کے لیے خود اس کے اندر بہت سے محاذ کھولنے ہوں گے۔ لہذا ان میں سے ہر ایک کے مقابلے کے لیے ضرورت ہے کہ چند باصلاحیت نوجوان اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ باہمت، محنتی اور کام میں غرق ہو جانے والے ہوں۔ ایسے نوجوانوں کے لیے نبی اکرم ﷺ کی بشارت ہے: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ)) ”تم میں سے بہترین انسان وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں“۔ قرآن حکیم کے معارف و حکم سے خود بھی بہرہ مند ہوں اور خلقِ خدا کو بھی مستفید کریں۔

جاہلیتِ قدیمہ کا ابطال جیسا کہ میں نے عرض کیا، محض ترجمہ قرآن سے بھی ہو جائے گا، لیکن اس جاہلیتِ جدیدہ کے ابطال اور اس کی تیخ کنی کے لیے قرآن حکیم میں غورو تدبر کرنا ہوگا اور اس کے معانی و مفاہیم کے جواہر کی یافت<sup>(۱)</sup> کے لیے قرآن کے بحرِ بیکراں میں غوطہ زنی کرنی ہوگی۔

ایک طویل حدیث میں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، قرآن حکیم کی شان میں یہ الفاظ آئے ہیں:

((وَلَا يَسْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلُقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْفَضِي عَجَائِبُهُ))<sup>(۲)</sup>

”علماء کبھی اس کتاب سے سیر نہ ہو سکیں گے نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے اس کے لطف و تاثیر میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات (یعنی نئے نئے علوم و معارف) کا خزانہ کبھی ختم ہو سکے گا۔“

قرآن مجید کی یہ تین شانیں جو نبی اکرم ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمائی ہیں، ان

میں سے آخری شان میری اس گفتگو سے بہت زیادہ متعلق ہے۔ ایک ہیرے کی کان کا تصور کیجئے جس میں کارکن لگے ہوئے ہیں اور ہیرے برآمد کر رہے ہیں۔ لیکن ایک وقت ایسا آ کر رہتا ہے کہ کان خالی ہو جاتی ہے اور ہیرے دستیاب نہیں ہوتے۔ لیکن قرآن ایسی معدن، ایسی کان نہیں ہے کہ جس کے متعلق کبھی یہ کہا جاسکے کہ حکمت کے موتی اب اس میں سے مزید نہیں نکل سکتے۔ قرآن تو اُس اتھاہ سمندر کے مانند ہے کہ انسان اس کی جتنی گہرائیوں میں جائے گا اتنے ہی اعلیٰ درجہ شہوار نکال کر لائے گا اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیش جاری و ساری رہے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ قرآن کی حکمت کے سمندر میں غوطہ زنی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس بحر کی گہرائیوں سے حکم و معارف کے موتی نکال لانے کے لیے جان گسل<sup>(۱)</sup> کوشش اور پتہ مار کر محنت کرنا ہوگی۔ لہذا ذہین و باصلاحیت اور دولت ایمانی کے حامل حضرات کو اس بحرِ زخار<sup>(۲)</sup> کی غواصی سے ہر دور کے تمام باطل نظریات اور خدا نا آشنا افکار کے ابطال کے لیے نہایت محکم دلائل اور قاطع براہین ملتے رہیں گے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((وَلَا تَنْقُضِي عَهْدَائِي)) پس اس دوسرے محاذ پر یعنی جاہلیتِ جدیدہ سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھی ہمیں قرآن کی شمشیر برائے<sup>(۳)</sup> ہاتھ میں لے کر مورچہ لگانا ہوگا۔

## محاذ سوم

### بے یقینی

ہمارے معاشرے میں معتد بہ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو بحمد اللہ شعوری سطح پر جاہلیتِ قدیمہ اور جدیدہ دونوں سے بچے ہوئے ہیں، لیکن ان کی بیماری ایک تیسری نوع کی بیماری ہے اور وہ ہے بے یقینی کی بیماری۔ یعنی مثبت طور پر جو یقین ہونا چاہیے انہیں وہ میسر نہیں ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ محض منفی چیزوں سے اگر آپ نے خود کو بچا بھی لیا تو اس

(۱) جان کو تکلیف دینے والا (۲) بہت شور کرنے والا سمندر (۳) کاٹ دار تلوار

سے آپ کے اخلاق و کردار پر اور آپ کی زندگی کے رُخ پر کوئی فیصلہ کن اثر مترتب نہیں ہو سکتا جب تک کہ مثبت طور پر یقین نہ ہو۔ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ کے درس کے ضمن میں میں نفاق اور ایمان کے بارے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ ان دونوں کو یوں سمجھئے کہ نفاق ایک منفی قدر (minus value) ہے اور ایمان ایک مثبت قدر (plus value) ہے۔ پھر اس مثبت قدر میں درجہ بدرجہ اضافہ ہوتا ہے۔ ایک میرا اور آپ کا ایمان ہے، ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، عشرہ مبشرہ اور بالخصوص انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ایمان ہے۔ تو یوں سمجھ لیجئے کہ یہ معاملہ لامحدود درجے (plus infinity) تک چلتا جائے گا۔ اسی طرح نفاق کا معاملہ ہے۔ اس کا ایک نقطہ آغاز بھی ہے اور اس کا تیسرا درجہ بھی ہے، جہاں پہنچ کر یہ ٹی بی کے مرض کی طرح لاعلاج ہو جاتا ہے۔ نفاق اور ایمان کے مابین ایک اور مقام ہے جسے میں ”zero level“ سے تعبیر کرتا ہوں۔ میں نے جس تیسرے طبقے کا ذکر کیا ہے، بد قسمتی سے اس کی اکثریت اسی سطح پر کھڑی ہے۔ یعنی کوئی منفی چیز بھی نہیں ہے نہ جاہلیتِ قدیمہ ہے نہ جاہلیتِ جدیدہ۔ کم از کم شعوری سطح پر نہیں ہے۔ لیکن مثبت طور پر یقین محکم والا ایمان بھی نہیں ہے اور اس کی طرف کوئی پیش قدمی بھی نہیں ہو رہی۔ تو ضرورت اسی یقین محکم اور ایمانِ کامل والے ایمان کی ہے، جیسے کہ علامہ اقبال نے کہا ہے۔

یقین پیدا کر اے ناداں یقین سے ہاتھ آتی ہے  
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغوری

ایمان جب یقین کی شکل اختیار کرے گا جب ہی تو اس میں ایک قوت پیدا ہوگی! جب ہی وہ شخصیت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالے گا اور پوری شخصیت کی کاپی ملٹ دے گا!

سورۃ الحجرات ہی کی آیت ۷ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ﴾ ”اللہ نے ایمان کو تمہارے نزدیک بہت محبوب کر دیا ہے اور اس کو تمہارے دلوں کے اندر مزین کر دیا ہے۔“ نورِ ایمان نے تمہارے دلوں کو منور کر دیا ہے۔ یہ ایمان اللہ کے فضل و کرم سے تمہارے دلوں میں راسخ اور جاگزیں ہو گیا ہے۔ جب تک یہ کیفیت نہ ہو، ایمان کے اثرات

انسان کے سیرت و کردار، معاملات اور عملی رویے پر مترتب نہیں ہوں گے۔ اب اس بے یقینی کا علاج کہاں سے لایا جائے؟ اس کا دارو کہاں ملتا ہے؟

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز<sup>(۱)</sup> ہے ساقی

اسی قرآن حکیم کی آیات بینات ہی سے اس بے یقینی کا علاج ہوگا۔ بقول مولانا ظفر علی خان مرحوم:

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئے دکانِ فلسفہ سے  
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآن کے سپاروں میں

یقین والے ایمان کا اصل ذریعہ (source) قرآن ہے۔ اگرچہ اس کا ایک ذریعہ اور بھی ہے، لیکن وہ ثانوی ہے۔ صاحب یقین کی صحبت سے بھی یقین والا ایمان پیدا ہوتا ہے۔ ”صحبت صالح ترا صالح کند“۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صاحب یقین کے قرب کی مثال ایسے ہے جیسے آگ کی ایک بھٹی دہک رہی ہو، آپ اس کے قریب جائیں گے تو حرارت آپ کو پہنچ کر رہے گی۔ یہ قانون طبعی ہے۔ برف کی سل کے پاس بیٹھیں گے تو برودت<sup>(۲)</sup> تو آپ سے آپ پہنچے گی۔ تو اگر کسی کے دل میں یقین والے ایمان کی شمع روشن ہے تو آپ اگر اُس کے قریب رہیں گے، اس کی صحبت سے فیض اٹھائیں گے تو آپ کو بھی یقین کی دولت ملے گی۔ لیکن میں اس کو ثانوی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہمیں پہلے یہ طے کرنا پڑے گا کہ وہ صاحب یقین کہاں سے آئے گا! تو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ ایسے صاحب یقین پیدا کرنے کا واحد ذریعہ بھی قرآن حکیم ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت میں یہ دوں گا کہ دنیا کے سب سے عظیم صاحب یقین، جن سے بڑا کوئی صاحب یقین ہو ہی نہیں سکتا، خاتم النبیین، سید المرسلین حضرت محمد ﷺ ہیں۔ قرآن مجید میں سورۃ الشوریٰ کی آخری سے پہلی آیت یعنی آیت ۵۲ میں نبی اکرم ﷺ کے ایمان و یقین کا تجزیہ کر کے بتا دیا گیا کہ حضور ﷺ کو ایمان و یقین کہاں سے ملا! ارشاد فرمایا گیا:

(۱) خوشی زیادہ کرنے والا (۲) ٹھنڈک

﴿وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا  
الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَإِنَّكَ  
لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾

”اور (اے نبی!) اسی طرح ہم نے اپنے امر سے ایک روح (یعنی یہ قرآن مجید)  
آپ کی طرف وحی کیا ہے (اس سے پہلے) آپ کو معلوم نہ تھا کہ کتاب کسے کہتے  
ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے! لیکن ہم نے اس (قرآن) کو نور بنا دیا جس کے ذریعہ  
سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں اور (اب جبکہ  
آپ ﷺ حامل قرآن بن گئے تو) آپ یقیناً نوع انسانی کو سیدھے راستے کی  
طرف ہدایت دیں گے۔“

نور وحی سے قبل حضور ﷺ کے ایمان کی ماہیت:

یہاں مجھے تھوڑی سی وضاحت کرنی ہوگی، مبادا مغالطہ ہو جائے۔ یہاں اشکال پیدا  
ہوتا ہے کہ کیا حضور ﷺ وحی کے نزول سے قبل مؤمن نہیں تھے؟ اسی نوع کی ایک بحث  
ہمارے یہاں حضور ﷺ کے آباء و اجداد کے بارے میں بھی چلتی ہے کہ کیا جناب عبداللہ  
جناب عبدالمطلب، جناب آمنہ کو ہم کافر یا مشرک کہیں گے؟ یہ بحثیں عوامی سطح پر ہوتی ہیں  
اور اس میں بڑی جذباتیت آ جاتی ہے۔ تو جان لیجیے کہ قرآن مجید ہمیں سورۃ النور کی آیات  
نور کے ذریعے یہ بتاتا ہے کہ نور ایمان کے دو اجزائے ترکیبی ہیں ایک نور فطرت اور ایک نور  
وحی۔ نور فطرت کی مثال صاف شفاف روغن کی ہے جو گویا بھڑکنے کے لیے بے تاب ہوتا  
ہے چاہے دیا سلائی ابھی اس کے قریب نہ آئی ہو جیسے پٹرول۔ تو درحقیقت انسان کی فطرت  
میں ایمان کا نور بالقوہ (potentially) موجود ہوتا ہے، البتہ اس پر پردے پڑ جاتے  
ہیں۔ بعض لوگوں کے وہ پردے اتنے دبیز اور بھاری ہوتے ہیں کہ اٹھائے نہیں اٹھتے۔  
نور وحی بھی آ کر ان لوگوں کے ان پردوں کو چیر کر دل کے اندر موجود نور فطرت کے روغن  
تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ لہذا ایسے لوگ نور ایمان سے محروم رہ جاتے ہیں۔ لیکن اس  
کے برعکس وہ شخص جس کے قلب پر کوئی حجاب نہیں، یعنی سلیم الفطرت اور سلیم القلب



انسان (جیسا کہ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں الفاظ آئے ہیں: ﴿إِذْ جَاءَ رَبُّكَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ﴾) (الصُّفْتُ) تو اس کے پاس جیسے ہی نورِ وحی آتا ہے تو یوں سمجھئے جیسے کہ آئینے کے سامنے روشنی آگئی۔ لہذا نورِ وحی سے اس کا آئینہ قلب جگمگا اٹھتا ہے۔ تو یہ ہے مثال نورِ فطرت اور نورِ وحی کی۔ اسی کو سورۃ النور میں نُورٌ عَلٰی نُورٍ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہذا ہم یوں کہیں گے کہ نبی اکرم ﷺ کے قلبِ مبارک میں ایمان بالقہوہ یا dormant form میں تو موجود تھا، لیکن اس کو تحریکِ وحی سے ملنے کی وجہ سے اسے متحرک کیا، اسے actualise کیا۔ یہ ہے مفہوم ان الفاظِ مبارکہ کا: ﴿مَا كُنْتُ تَذَرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾

سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات جن کے متعلق صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ یہ آیات حضور ﷺ کو شبِ معراج میں اُمت کے لیے بطور تحفہ خاص عطا ہوئی تھیں، ان میں سے پہلی آیت میں قرآن حکیم پر پہلے خود نبی اکرم ﷺ کے ایمان لانے کا ذکر ہے اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان لانے کا: ﴿أَمَّا الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ﴾  
دلکش ترین ایمان کس کا ہے؟

اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کی ایک بڑی پیاری حدیث مشکوٰۃ شریف کے آخری باب: باب ثوابِ ھذہ الامۃ میں امام بیہقی کی ”دلائل النبوة“ کے حوالے سے آئی ہے۔ اس حدیث کو حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد کے واسطے سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں۔ چشمِ تصور سے دیکھئے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ مسجد نبوی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مجلس میں رونق افروز ہیں۔ آپ صحابہؓ سے سوال کرتے ہیں: ((أَيُّ الْخَلْقِ أَعْجَبُ إِلَيْكُمْ إِيْمَانًا)) ”مجھے بتاؤ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟“، ”عجب، عجیب سے اسمِ تفضیل ہے۔ اردو میں عجیب کا لفظ حیران کن یا غیر معمولی بات کے لیے مستعمل ہے، لیکن عربی میں عجیب دل کو لبھانے والی شے کو کہتے ہیں، یعنی دلکش اور دل خوش کن چیز۔ سورۃ الاحزاب میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ فرمایا گیا: ﴿وَكُودُ

أَعَجَبَكَ حُسْنُهُنَّ؟” اور چاہے ان کا حسن آپ کے دل کو کتنا ہی لبھانے والا کیوں نہ ہو۔ سورۃ المنافقون میں ارشاد ہوا: ﴿وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ﴾ ”اور جس وقت آپ ان کو دیکھتے ہیں تو ان کے بدن آپ کو خوش لگتے ہیں“۔ تو حضور ﷺ نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ دلکش دل کو لبھانے والا اور حسین ایمان کس کا ہے؟ یہ بھی حضور ﷺ کی تعلیم و تربیت کا ایک انداز ہے۔ صحابہ نے عرض کیا: ”فرشتوں کا“۔ حضور ﷺ نے اس کو رد فرما دیا: ((وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ وَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ)) ”وہ ایمان کیسے نہیں لائیں گے جبکہ وہ اپنے رب تعالیٰ کے پاس ہیں!“ ان کے لیے تو غیب کا پردہ حائل نہیں ہے۔ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں تو اس میں کون سا کمال ہے؟ پھر صحابہ نے عرض کیا: فَالْنَّبِيُّونَ ”پھر نبیوں کا ایمان ہے!“

حضور ﷺ نے فرمایا: ((وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ وَالْوَحْيُ يَنْزِلُ عَلَيْهِمْ)) ”وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے جبکہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے!“ انبیاء علیہم السلام پر اللہ کا فرشتہ وحی لے کر نازل ہوتا ہے، انہیں غیب کی خبروں سے مطلع کرتا ہے، پھر اللہ ان کو اپنی نشانیوں میں سے کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کراتا ہے۔ لہذا وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے اور ان کا ایمان ”اعجب“ کیسے ہوگا! تیسری بار صحابہ کرام نے بڑی ہمت و جرأت کر کے اور ڈرتے ڈرتے عرض کیا: ”فَنَحْنُ“ ”پھر ہم ہیں“۔ ہمارا ایمان اعجب ہے۔ حضور ﷺ نے اس کو بھی رد فرما دیا: ((وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ وَأَنَا أَظْهَرُكُمْ)) ”تم کیسے ایمان نہ لاتے جب کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں“۔ یعنی اللہ کی سب سے بڑی نشانی اور اس کا سب سے بڑا معجزہ تمہارے سامنے ہے۔ تم کو میرے دیدار اور میری صحبت کا فیض حاصل ہے۔ میری ذات سے جن برکات کا ظہور اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا جو نزول ہو رہا ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ انتہائی قلیل تعداد اور بے سرو سامان ہونے کے باوجود اللہ کی نصرت و تائید سے تمہیں مشرکین و کفار پر جو فتوحات حاصل ہو رہی ہیں، ان کا تم اپنی چشم سر سے ہر لمحہ مشاہدہ کرتے ہو۔ میں نے بنفس نفیس تمہیں توحید کی دعوت پہنچائی ہے، تم پر قرآن مجید کی تبلیغ اور اس کے معارف و حکم کی تبیین کی ہے، تو تم کیسے ایمان نہ لاتے! اب حضور ﷺ خود جواب ارشاد فرماتے ہیں:

((إِنَّ أَعْجَبَ الْخَلْقِ إِلَىٰ إِيْمَانًا لَّقَوْمٌ يَّكُونُونَ مِنْ بَعْدِي)): ”میرے نزدیک تو سب سے زیادہ دلربا، دلکش اور حسین ایمان اُن لوگوں کا ہوگا جو میرے بعد ہوں گے“ ((يَجِدُونَ صُحُفًا فِيهَا كِتَابٌ)) ”ان کو تو اوراق ملیں گے جن میں ایک کتاب (قرآن مجید) درج ہوگی۔“ ((يُؤْمِنُونَ بِمَا فِيهَا)) ”وہ اس پر ایمان لائیں گے جو کچھ اُن اوراق میں ہوگا“۔ یعنی وہ نہ میرے دیدار سے شاد کام ہوئے، نہ انہوں نے میری صحبت سے فیض اٹھایا، نہ انہوں نے ان برکات، معجزات، نزولِ رحمت اور نصرتِ الہی کا چشم سر مشاہدہ کیا، لیکن وہ اس قرآن پر ایمان لانے کے ذریعے سے ان تمام حقائق کو نبیہ و تشریبیہ پر ایمان لائیں گے جو میں لے کر آیا ہوں۔

اس مقام پر ایک اہم بات کی وضاحت ضروری ہے۔ یہاں افضلیت کی بات نہیں ہو رہی۔ انبیاء کے بعد افضل ترین ایمان لا ریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کا ہے۔ یہاں حسین و دلکش ایمان کی بات ہو رہی ہے، ان کے ایمان کی جنہوں نے نہ اللہ کی سب سے عظیم نشانی یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور کا دیدار کیا اور نہ دنیا کے عظیم ترین مربی و مزی کی صحبت سے مستفیض ہوئے، لیکن انہوں نے نورِ ایمان قرآن مجید سے حاصل کیا جو درحقیقت منبع و سرچشمہ ایمان ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نور قرار دے رہا ہے: ﴿جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ تو ایک سند قرآن مجید سے اور ایک سند حدیث شریف سے کافی ہے۔ معلوم ہوا کہ بے یقینی کے اس روگ کا واحد علاج قرآن حکیم ہی ہے۔ یہی بے یقینی کو ختم کرنے والی واحد تلوار ہے۔ چنانچہ ”بے یقینی“ کے خلاف بھی ”جہاد بالقرآن“ کرنا ہوگا۔ اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں!

### محاذ چہارم

## نفس پرستی اور شیطانی ترغیبات

اس دور میں نفس پرستی اور شیطانی ترغیبات کا محاذ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ضمن میں عام لوگوں کی نفس پرستی اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ اس کا سبب تو وہی ہے جس پر

جاہلیتِ قدیمہ، جاہلیتِ جدیدہ اور بے یقینی کے محاذوں کے ضمن میں گفتگو کے دوران اشارات ہو چکے ہیں اور پھر اس نفس پرستی کا تعلق زیادہ تر افراد کی اپنی ذاتی زندگی سے ہے لیکن ہمارے یہاں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس نے اسے باقاعدہ ایک منظم ادارے (institution) کی شکل دے رکھی ہے اور کلچر اور ثقافت کے نام پر منکرات و فواحش کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ایک مسلمان کے دل میں اباحت اور منکرات سے جو بُعد اور نفور ہوتا تھا اور حرام چیزوں کے خلاف دل میں جو جذبہ نفرت ہوتا تھا اسے ثقافتی طائفوں، ریڈیو اور ٹی وی ڈراموں، راگ ورنگ کی محفلوں اور تعلیمی، کاروباری، دفتری اور صنعتی اداروں میں مردوزن کے مخلوط طریق کار کے ذریعے ختم کر دیا گیا ہے۔ اور اس سارے نظام کو ایک طرف اباحت پسند طبقے اور دوسری طرف خود سرکاری سطح پر سرپرستی حاصل ہے۔ اس کو تہذیب، ثقافت، فنون لطیفہ اور مردوزن کی مساوات کے خوشنما نام دیے گئے ہیں۔ اب بے پردگی، نیم عریانی، خواتین کی رنگین و مزین تصاویر کو تہذیب و تمدن کی ناگزیر ضرورت قرار دیا گیا ہے اور اس طرح عورت کو چراغِ خانہ سے شمع محفل اور اس سے بڑھ کر اشتہاری جنس بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ ہمارے اخبارات و رسائل (اللہ ماشاء اللہ) اور دوسرے ذرائع ابلاغ اس میں مسابقت کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں اس کو وقت اور زمانے کا تقاضا سمجھ لیا گیا ہے۔ دین تو رہا ایک طرف، ہماری جو معاشرتی، تہذیبی اور مجلسی اقدار تھیں ان سب کو بھی پائمال کیا جا رہا ہے۔

جو لوگ یہ سب کچھ کر رہے ہیں وہ اگرچہ اقلیت پر مشتمل ہیں لیکن بد قسمتی سے ان کا ذرائع ابلاغ پر پوری طرح غلبہ اور تسلط ہے۔ اس اقلیتی گروہ نے کچھ وقتی تقاضوں اور کچھ لوگوں کے دینی رجحان کے پیش نظر ان ذرائع ابلاغ کا کچھ حصہ اسلامی اور دینی پروگراموں کیلئے بھی مخصوص کر رکھا ہے جو اکثر و بیشتر محض بہلاوے اور دکھاوے کیلئے ہوتے ہیں اور بڑی چابک دستی، ہوشیاری اور احتیاط یہ برتی جاتی ہے کہ کہیں کوئی ایسا کام نہ ہو جائے کہ ان ذرائع ابلاغ سے عوام الناس تک دین کا حقیقی پیغام پہنچ جائے۔ مبادا اعجازِ قرآنی لوگوں کے اذہان و قلوب میں نفوذ کر کے ان کو مخر کر لے۔ یہ وہی خوف ہے جس کا اظہار علامہ اقبال مرحوم نے اپنی نظم ”ابلیس کی مجلسِ شوریٰ“ میں ابلیس کی زبان سے اس طرح کرایا ہے۔

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف  
ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں!

لہذا سرکاری ذرائع ابلاغ میں دین و مذہب کے نام سے جو پروگرام رکھے جاتے ہیں یا اخبارات و رسائل میں جو صفحات مختص کیے جاتے ہیں ان میں بظاہر احوال کوشش یہ ہوتی ہے کہ غیر محسوس طریقے سے انتشار (confusion) کو ہوا دی جائے۔ چنانچہ کوئی مشرق کی بات کہتا ہے تو کوئی مغرب کی بات لکھتا ہے۔ کوئی شمال کی بات کہے گا تو اگلا جنوب کی بات کرے گا تا کہ دین و مذہب کے بارے میں نفسیاتی الجھاؤ اور ذہنی انتشار بڑھتا چلا جائے۔ پھر بالفرض کوئی موثر بات آ ہی جائے تو فوری طور پر اس کے متصل بعد کچھ ایسے پروگرام رکھ دیے جائیں گے جن کے ذریعے یہ اثرات زائل ہو جائیں، ذہن سے محو ہو جائیں، یعنی مع چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب

پھر ان تمام ذرائع ابلاغ و وسائل ابلاغ کے کرتا دھرتا اُن خواتین کے بیانات، مضامین، انٹرویوز، تصاویر اور خبروں کو انتہائی نمایاں کرتے ہیں جو مغرب زدہ اور اباحت پسند ہیں اور ہمارے ملک میں انتہائی اقلیت میں ہیں۔ لیکن تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ گویا ہمارے ملک کی خواتین کی اکثریت اسی طرز فکر کی حامل خواتین کی ہے جن کے نزدیک دین و مذہب اور ہماری تہذیب و معاشرتی اقدار پر کاکہ کے برابر بھی وقعت اور حیثیت نہیں رکھتیں۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی عظیم اکثریت ان دین پسند خواتین پر مشتمل ہے جن کے نظریات ان مغرب زدہ خواتین کے نظریات کے بالکل برعکس ہیں۔ لیکن معاملہ چونکہ یہ ہے کہ مع ”لیکن قلم در کف دشمن است“ لہذا خواتین کے اس قلیل ترین طبقے کو وسائل ابلاغ کے ذریعے اس طرح project اور نمایاں کیا جاتا ہے گویا پاکستان میں بسنے والی تمام خواتین اسی نظریہ و خیال کی حامی ہیں۔ یہ ہے اس جہاد کا چوتھا محاذ۔ اب سوال یہ ہے کہ اس محاذ پر ہم کیا کر سکتے ہیں!

کشیہ شمشیر قرآن نش کنی

ان ذرائع ابلاغ سے معاشرے میں نفس پرستی کا جو نفوذ ہو رہا ہے اور انسان کی سوچ

اور رجحانات و میلانات کو جس طرح غلط رخ پر ڈالا جا رہا ہے اس سے مقابلے کے لیے بھی ہمارے پاس ڈھال اور تلوار قرآن ہی ہے۔ میں نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے اس عزم کو بہت عام کیا ہے جس کا حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۲۰ء میں اسارتِ مالٹا سے رہائی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں علماء کے ایک اجتماع میں اظہار کیا تھا:

”میں وہیں (مراد ہے اسارتِ مالٹا) سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کردوں کہ قرآن کریم کو لفظاً و معنیاً عام کیا جائے۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے.....“

لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے علمائے حقانی و ربانی جو اپنا تعلق امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہما اللہ سے قائم کرنے کو اپنے لیے موجب اعزاز و افتخار سمجھتے ہیں، وہ فقہی و کلامی تعبیر اور استنباط کی بحثوں سے صرفِ نظر کر کے ایک منظم تحریک کی شکل میں حضرت شیخ الہندؒ کے عزم کو عملی شکل دینے کے لیے کمر ہمت کس لیں۔ شہر شہر، محلہ محلہ، کوچہ کوچہ، قریہ قریہ عوامی درسِ قرآن کے حلقے قائم کریں اور قرآن مجید، فرقانِ حمید کی شمشیر برّائے اں کے ذریعے نفس پرستی اور اباحت پسندی کے خلاف جہاد کریں اور اس سیلاب کے آگے سدِّ ذوالقرنین بن جائیں۔ یہی پیغام اس مردِ قلندر نے آج سے قریباً نصف صدی قبل دیا تھا جس کو بجا طور پر حکیم الامت کہا جاتا ہے، یعنی ڈاکٹر علامہ اقبال مرحوم و مغفور۔ ان کا پیغام تھا۔

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم      تاکجا در حجرہ ہا باشی مقیم!  
در جہاں اسرار دیں رافاش کن      نکتۂ شرع مبیں رافاش کن!  
”اے وہ شخص جسے حاملِ قرآنِ عظیم ہونے پر فخر ہے، آخر کب تک حجرہوں اور گوشوں میں دبے رہو گے؟ اٹھو اور دنیا میں دینِ حق کے اسرار و رموز اور عرفان و فیضان کو عام کرو اور شریعتِ اسلامی کے حکم و عبر کی نشر و اشاعت کیلئے سرگرم عمل ہو جاؤ!“

یہ ہے علامہ مرحوم کا پیغام حاملِ قرآن اُمت اور بالخصوص علمائے حق کے لیے۔ بفضلہ تعالیٰ

ملک کا کوئی قابل ذکر شہر ایسا نہیں ہے جس میں غالب اکثریت ایسے علمائے کرام کی نہ ہو جن کا امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ یا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین جیسے اکابر سے ارادت و عقیدت کا تعلق نہ ہو۔ آخر الذکر بھی درحقیقت ولی اللہی اور دیوبند کے مکتب فکر سے وابستہ رہے ہیں اور تھانوی مکتب فکر ہو یا ندویؒ یہ سب ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں۔ اسی طرح مسلک سلفی کا تعلق تو براہ راست حضرت شاہ اسماعیلؒ جیسے غازی و مجاہد اور شہید اور امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے قائم ہے۔ اگر ہمارے یہ علماء عظام منظم ہو کر عوامی درس قرآن کی تحریک برپا کر دیں تو ان شاء اللہ العزیز نفس پرستی، اباحت پسندی اور خدا نا آشنا ثقافت و فنون لطیفہ کے نام سے جو ہر ہمارے معاشرے میں پھیلا یا جا رہا ہے اس کا سد باب بھی ہو جائے گا اور جیسے جیسے قرآن حکیم اُمت کے اذہان و قلوب میں نفوذ اور سرایت کرے گا تو نتیجتاً ذرائع ابلاغ پر قابض اباحت پسند قلیل طبقہ یا تو اپنا رویہ تبدیل کرنے پر یا اسلام کے سچے خادموں کے لیے جگہ خالی کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ البتہ اس کے لیے ناگزیر شرط یہ ہے کہ تمام انواع کے فقہی و کلامی اختلافات و تاویلات سے دامن بچایا جائے اور قرآن حکیم کا انقلابی پیغام عامۃ الناس تک پہنچایا جائے۔ اگر اس احتیاط کو ملحوظ نہ رکھا گیا تو ابلیس کا وہ مشورہ کارگر ہوگا جو اُس نے اپنی شوریٰ میں بقول علامہ اقبال پیش کیا تھا کہ ۛ

ہے مہی بہتر الہیات میں الٰہجہ رہے یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الٰہجہ رہے  
ذہن و فکر کی تطہیر اور سیرت و کردار کی تعمیر کی اساس اور نفس پرستی کے سیلاب کے آگے  
کوئی چیز اگر سدّ اور بند بن سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف قرآن مجید ہے۔ اباحت و نفس  
پرستی کے قلع قمع کے لیے اگر ہمارے ہاتھ میں کوئی تیغ بے زہنار ہے تو وہ قرآن مجید ہے۔  
علامہ اقبال کے یہ اشعار میں نے بار بار آپ کو سنائے ہیں۔ انہیں پھر پیش کر رہا ہوں۔ یہ  
اشعار میرے مفہوم و مطلوب کو آپ کے اذہان و قلوب میں منتقل اور جاگزیں کرنے میں  
بہت مدد و معاون ہوں گے ۛ

کشتن ابلیس کارے مشکل است زانکہ او گم اندر اعماق دل است  
خوشر آں باشد مسلمانش کنی کشتہ شمشیر قرآنش کنی!  
”ابلیس کو ہلاک کر دینا ایک نہایت مشکل کام ہے اس لیے کہ اس کا سیرِ نفسِ انسانی  
کی گہرائیوں میں ہے۔ بہتر صورت یہ ہے کہ اسے قرآنِ حکیم کی حکمت و ہدایت کی  
شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنالیا جائے۔“

واقعہ یہ ہے کہ آج ہماری ملی و قومی زندگی کے شعور کی گہرائیوں میں آرٹ کو نسل، ثقافتی  
طائفوں کے مبادلوں، راگ و رنگ کی محفلوں، رومانی ڈراموں، افسانوں اور لٹریچر اور ٹیلی ویژن  
کے مختلف "Cultural Shows" نے ڈیرا لگا رکھا ہے۔ ہمارے ملک کی اعلیٰ ترین شخصیتیں  
اس بیٹھے زہر کی سرپرستی کر رہی ہیں۔ ان سے نبرد آزما ہونا آسان کام نہیں ہے۔ بہتر شکل یہی  
ہے کہ قرآن کی تلوار سے ان ارباب اختیار کو مسلمان بنانے کی کوشش کی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ نفسانیت اور شہوانیت تو ہمارے نفس کے اندر ہی ہیں۔ شیطان ان  
نفسانی خواہشات و داعیات کو بھڑکاتا ہے، انہیں مشتعل کرتا ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں  
کرتا۔ چنانچہ آخرت میں جب فیصلے چکا دیے جائیں گے تو جو لوگ دنیا میں شیطان کے  
دجل و فریب کا شکار ہوئے تھے وہ اس کو ملامت کریں گے۔ شیطان اس کا جو طویل جواب  
دے گا اُسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ ابراہیم میں نقل فرمایا ہے۔ اس جواب میں وہ کہے گا:

﴿وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ  
فَلَا تَلُمُوْنِيْ وَلَوْ مَوَّآ اَنْفُسُكُمْ مَا اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا اَنْتُمْ  
بِمُصْرِخِيْ﴾ (آیت ۲۲)

”میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں میں نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا کہ تمہیں اپنے راستے  
کی طرف بلایا (اسے خوش نما و فریب اور تمہارے نفس کے لیے لذت آفریں بنا کر  
پیش کیا) تو تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ پس اب مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے  
آپ کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری کوئی فریادری کر سکتا (اور تمہارے کام آ  
سکتا) ہوں اور نہ ہی تم میری فریادری کر سکتے (اور میرے کام آ سکتے) ہو۔“



معلوم ہوا کہ شیطان اپنے راستے کو بہت مزین کر کے انسان کو اس کی طرف بلاتا ہے پھر انسان کے نفس میں اس کے پورے وجود میں اس کی دعوت خوش نماز ہر بن کر سرایت کر جاتی ہے۔ لہذا اس زہر کے لیے تریاق بھی وہ درکار ہے جو پورے وجود میں سرایت کر سکے اور پھر جس میں حلاوت اور تائثر بھی ہو۔ ایسا کوئی تریاق سوائے قرآن کے اور کوئی نہیں ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود

جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

”یہ قرآن اگر کسی کے اندر اتر جائے تو اُس کے باطن میں ایک انقلاب آجائے اور

فرد کے اندر کا یہ انقلاب ایک بین الاقوامی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔“

## محاذ پنجم

### فرقہ واریت

ہمارا پانچواں محاذ جس پر ہمیں جہاد بالقرآن کرنا ہے وہ فرقہ واریت، تشنیت، انتشار اور باہمی اختلافات کا محاذ ہے۔ یہ عناصر وحدتِ اُمت کو صدیوں سے دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ انہی کے باعث دولتِ عباسیہ ختم ہوئی اور سقوطِ بغداد کا سانحہ پیش آیا۔ انہی کی وجہ سے بغداد کے گلی کوچوں میں اہل سنت کے دو گروہ دست بگریباں ہوئے، تلواریں بے نیام ہوئیں اور خون کی ندیاں بہائی گئیں۔ سلطنتِ ہسپانیہ کے زوال و انحطاط اور پھر کامل سقوط کے عوامل میں جہاں قبائلی عصیتیں کار فرما تھیں وہاں اس تباہی میں فقہی و کلامی اختلافات کا عمل دخل بھی تھا۔ اور اب محسوس ہو رہا ہے کہ یہ اختلافات سلطنتِ خداداد پاکستان کیلئے بھی روز بروز زیادہ سے زیادہ نازک اور خطرناک صورت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ماضی قریب میں بادشاہی مسجد کے ایک مبینہ واقعہ بلکہ محض افواہ پر معرکہ آرائی کی جو تکلیف دہ صورتِ حال بنی تھی یہ چنگاری جنگل کی آگ بن سکتی تھی اور ہم میں سے ہر شخص اپنے طور پر اس کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ آگ ہمارے لیے کتنی ہولناک اور تباہ کن ثابت ہو

سکتی تھی۔ فرقہ واریت کا بارود اب بھی ہمارے یہاں موجود ہے، کوئی شریک نہ گروہ اس کو کسی وقت بھی دیا سلائی دکھا سکتا ہے۔ اس نازک صورت حال میں ہماری ملی و سیاسی زندگی اور ہمارے وطن کے مستقبل کے لیے جو خطرات مضر ہیں، میں اس وقت ان کے بارے میں بات نہیں کر رہا۔ پھر یہ کہ فی الوقت صورت حال جس ہلاکت خیزی کے دہانے تک پہنچی ہوئی ہے اس کے اسباب و علل کے متعلق بھی میں اس وقت کچھ عرض نہیں کروں گا۔ اس وقت مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اس کا علاج صرف تشویش ظاہر کرنے سے تو نہیں ہو جائے گا، محض پریشان ہونے سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا! اس کے لیے مثبت کام کرنا ہوگا۔ اس کے لیے بھی جہاد کرنا ہوگا اور اس جہاد کے لیے بھی قرآن ہی واحد تلوار ہے۔

### اعتصام شکر کہ جبل اللہ اوست :

فرقہ واریت کے اس عفریت کا سر قلم کرنے، اس کا قلع قمع کرنے اور اس کو نیست و نابود کرنے کے لیے واحد تلوار صرف قرآن ہے۔ یہی سبق ہم کو سورۃ آل عمران کی آیت ۱۰۳ کے ابتدائی الفاظ میں ملتا ہے: ﴿وَأَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ تمام مفسرین اور تمام علماء عظام کا اس امر پر اجماع ہے کہ یہاں جبل اللہ سے مراد قرآن مجید ہے اور یہ رائے متعدد احادیث صحیحہ کی روشنی میں قائم کی گئی ہے۔ آیت مبارکہ کے اس حصے سے علامہ اقبال مرحوم نے جو کچھ اخذ کیا ہے وہ میں آگے بیان کروں گا۔ اس وقت میں اکبر الہ آبادی مرحوم کا ایک شعر سناتا ہوں جو ہمارے موجودہ حالات پر منطبق ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں ع

صوم ہے ایمان سے ایمان غائب صوم گم

یعنی آدمی روزہ تو ایمان ہی کے تقاضے کے تحت رکھ سکتا ہے۔ (خاص طور پر موسم گرما کے روزے) جب ایمان ہی نہیں رہا تو صوم تو آپ سے آپ گیا! پھر اس کا التزام و اہتمام کیسے ہوگا؟ اگلا مصرع نہایت قابل توجہ ہے ع

قوم ہے قرآن سے قرآن رخصت قوم گم

مسلمانوں کی ملی اور قومی شیرازہ بندی قرآن سے ہے۔ قرآن درمیان سے ہٹ گیا یا آپ کی توجہ قرآن سے ہٹ گئی تو نتیجہ ایک ہی ہوا یعنی وحدت ملی کا شیرازہ بکھر گیا۔ اسے اقبال نے اس طرح تعبیر کیا ہے ع

یا مسلمان مَر دیا قرآن بمر د!

یعنی یا مسلمان مر چکا ہے یا (معاذ اللہ) قرآن مر چکا ہے۔ اقبال دراصل یہ کہہ رہے ہیں کہ قرآن تو زندہ و پائندہ ہے، لیکن مسلمانوں کی توجہ مریچی ہے۔ قرآن سے ان کا شغف و التفات ختم ہو چکا ہے۔ چنانچہ علامہ مرحوم نے مسلمانوں کو چونکا نے کی غرض سے یہ پیرایہ بیان اختیار کیا ہے۔

عظمت قرآن کے بیان میں علامہ اقبال کے یہ اشعار بھی انتہائی قابل توجہ ہیں۔  
 فاش گویم آنچه در دل مضمر است    این کتابے نیست چیزے دیگر است  
 مثل حق پنہاں و ہم پیدا است این    زندہ و پائندہ و گویا ست این  
 صد جهان تازه در آیات اوست    عصر ہا پیچیدہ در آفات اوست  
 ”اس قرآن کے بارے میں جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اُسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں! حقیقت یہ ہے کہ یہ محض کتاب نہیں ہے، کچھ اور ہی شے ہے! یہ ذات حق سبحانہ و تعالیٰ کا کلام ہے لہذا اُسی کی مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی۔ اور یہ کتاب جیتی جاگتی اور بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی ہے۔ اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں۔“

لیکن مسلمانوں کا اس کتاب الہی اس ”ہدٰی للناس“ اس فرقان حمید اس نسخہ شفا کے ساتھ کیا سلوک و رویہ باقی رہ گیا ہے اس کا نوحہ اقبال اس طرح کرتے ہیں۔

بآتش ترا کارے جز این نیست!    کہ از لیلین او آساں بمیری!  
 ”لیکن افسوس کہ اے مسلمان! تجھے اس قرآن کی آیات سے اب اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ اس کی سورہ لیلین کے ذریعے موت کو آسان کر لے۔“

علامہ کے یہ اشعار بھی میں بارہا اپنی تقریر و تحریر میں پیش کر چکا ہوں جن میں

انہوں نے بڑی دل سوزی کے ساتھ ہماری ذلت و خواری ہمارے انتشار ہماری آپس کی چپقلش اور تنازعات کی تشخیص بھی کی ہے اور علاج بھی تجویز کیا ہے۔

خوار از مجبوری قرآن شدی شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی  
اے چو شبنم بر زمیں افتندہ در بغل داری کتابِ زندہ  
حضرت شیخ الہندؒ نے اسارتِ مالٹا سے رہائی کے بعد پوری دنیا کے مسلمانوں کی دینی و دنیوی تباہی و بربادی کا جہاں ایک سبب ”قرآن کو چھوڑ دینا“ قرار دیا تھا وہاں دوسرا سبب ”آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی“ بھی بیان کیا تھا۔ عوامی درس قرآن کے حلقے قائم کرنے کے عزم کے ساتھ ساتھ آپ نے اس ارادہ کا اظہار بھی کیا تھا کہ مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو ختم کرنے کے کام میں بھی وہ اپنی باقی زندگی صرف کریں گے۔ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ جو اس روایت کے راوی ہیں انہوں نے اس پر اس طرح تبصرہ فرمایا تھا کہ ”حضرتؒ نے ہمارے زوال و انحطاط کے جو دو سبب بیان کیے تھے غور کیا جائے تو یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ ہمارے باہمی اختلافات اور باہمی جنگ و جدال کا سبب بھی قرآن کو ترک کر دینا ہی ہے“۔ ان دو اکابر کا اس پر کامل اتفاق نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح اور ان کے باہمی اختلاف کو ختم یا کم از کم ان کی شدت کو کم کرنے اور ان میں اعتدال پیدا کرنے کا واحد ذریعہ اعتصام بالقرآن ہے۔

علامہ اقبال نے اسے جس پر شکوہ انداز میں ادا کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ فرماتے ہیں۔  
ازیک آئینی مسلمان زندہ است پیکرِ ملت ز قرآن زندہ است  
ماہمہ خاک و دل آگاہ اوست اعتصامش کن کہ جبل اللہ اوست  
”وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملت کے جسدِ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے، ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں ہمارا یہ وجود مٹی ہے! ہاں اس میں دل ہے جس کی دھڑکن اس کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ (ہمارا قلب زندہ اور ہماری روح تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔) اس کو مضبوطی کے ساتھ تھامو کہ یہی جبل اللہ یعنی اللہ کی مضبوط رستی ہے۔“

اور فرماتے ہیں۔

چوں گہر در رشقہ او سفتہ شو ورنہ مانند غبار آشفته شو  
”اے ملتِ اسلامی! اب بھی وقت ہے کہ تو اپنے آپ کو تسبیح کے موتیوں کی طرح  
قرآن کے رشتے میں باندھ لے اور پرولے ورنہ پھر اس کے سوا اور کوئی صورت  
نہیں کہ خاک اور دھول کی مانند پریشان و منتشر اور ذلیل و خوار رہ!“

میراثِ ثریہ ہے اور میں اسے تقریر میں بھی اور تحریر میں بھی برملا ظاہر کرتا رہا ہوں کہ  
ماضی قریب میں قرآن کی عظمت اور مرتبہ و مقام کا انکشاف جس شدت کے ساتھ علامہ  
اقبال پر ہوا شاید ہی کسی اور پر ہوا ہو۔ علامہ مرحوم نے اپنی شاعری بالخصوص فارسی شاعری  
میں نہایت دل گداز، مؤثر اور تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جانے والے مختلف اسالیب  
سے ملتِ اسلامیہ کو جھنجھوڑا ہے اور اسے دعوت دی ہے کہ دین و دنیا کی فوز و فلاح چاہتے ہو تو  
قرآن کو تھامو۔ یہی تمہارے اتحاد اور تمہارے عروج کا واحد ذریعہ ہے۔ ان کا یہ شعر آج  
زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن! نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن!  
”تو اگر مسلمان ہو کر جینے کا خواہش مند ہے اس کی تمنا اور آرزو رکھتا ہے تو اچھی طرح  
جان لے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنی حیات کی بنیاد قرآن پر قائم کرے۔“

## حاصل کلام

حاصل کلام یہ ہے کہ ہمارے سامنے پانچ محاذ ہیں جن کے خلاف منظم ہو کر جہاد  
بالقرآن کے لیے کمر کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ میں سے اکثر لوگ جانتے ہیں کہ اسی  
جہاد کے لیے میں نے اپنا پروفیشن تہج دیا۔ میں اپنی زندگی کے بہترین دن اسی کام میں لگا چکا  
ہوں۔ اب تو بڑھاپے میں قدم رکھ چکا ہوں۔ ”شادم بر عمر خویش کہ کارے کردم“۔  
الحمد للہ میری زندگی کے جو بہترین ایام تھے وہ اس جہاد بالقرآن میں بسر ہوئے ہیں۔  
میرے شب و روز اور میری صلاحیتیں اور توانائیاں دروسِ قرآن، تقاریر، خطباتِ جمعہ، انجمن  
خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے قیام، قرآن کانفرنسوں اور محاضراتِ قرآنی کے انعقاد

قرآنی تربیت گاہوں کے انصرام، قرآنی سلسلہ اشاعت کے انتظام، قرآن کے پیغام پر مشتمل مطبوعات کی اشاعت اور ملک کے مختلف شہروں کے دعوتی دوروں میں لگی ہیں۔

اور الحمد للہ قرآن کا پیغام لے کر میں دوسرے ممالک میں بھی گیا ہوں۔ صنم خانہ ہند، عالم عرب، امریکہ اور یورپ میں چراغ روشن کیے ہیں۔ لوگوں کو آمادہ کیا ہے کہ مکرکیں اور اس جہاد بالقرآن کے لیے میدان میں آئیں۔ ظاہر بات ہے کہ کام کے نتائج ظاہر ہونے میں وقت لگتا ہے۔ آپ کے اسی شہر لاہور میں میں نے یہ کام چھ سال تنہا کیا، جبکہ کوئی ادارہ نہیں تھا، کوئی تنظیم نہیں تھی۔ مطب بھی کر رہا تھا اور یہ کام بھی کر رہا تھا۔ وہ جو حسرت موہائی نے کہا تھا ”ہے مشقِ سخن جاری اور چکی کی مشقت بھی“ تو یہ دونوں چیزیں میرے لیے بھی جاری تھیں۔ پھر ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن قائم ہوئی اور بقول اقبال۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں  
بہر حال میرا اور انجمن کا کام اسی جہاد بالقرآن کے گرد گھومتا رہا ہے۔ آج میں نے اس پورے کام کو پانچ محاذوں کی شکل میں مرتب کر کے آپ حضرات کے سامنے رکھ دیا ہے، ورنہ یہ باتیں تو میں نے بارہا کہی ہیں۔ میں ان کو مختلف موضوعات و عنوانات کے تحت اور مختلف پیرایوں میں بیان کرتا رہا ہوں۔

آج مجھے آپ حضرات سے یہ کہنا ہے کہ رمضان المبارک کے جمعہ کی اس مبارک ساعت<sup>(۱)</sup> میں کچھ غور کیجئے، کچھ سوچئے، کچھ اپنے گریبانوں میں جھانکیے۔ میں عرض کروں گا کہ ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ہم میں سے ہر شخص یہ معین (assess) کرے کہ میں قرآن کریم کے اعتبار سے کس مقام پر کھڑا ہوں۔ کیا میں قرآن پڑھتا ہوں؟ قرآن پر غور و تدبر کرتا ہوں؟ قرآن سے مجھے کتنا شغف اور تعلق ہے؟ پھر یہ کہ قرآن کا جو حکم سامنے آجائے کیا بے چون و چرا اُسے مان لیتا ہوں؟ کیا قرآن کے پیغام کو آگے پہنچانے کا کوئی ارادہ، کوئی عزم میرے اندر ہے؟ اس ضمن میں تن من دھن سے کوئی خدمت میں نے آج تک کی ہے؟ یہ خود احتسابی ضروری ہے۔ انسان پہلے خود اپنا جائزہ لے، پھر فیصلہ کرے کہ

(۱) واضح رہے کہ یہ خطاب رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ کے ایک مبارک جمعہ کے موقع پر کیا گیا تھا۔

بحیثیت مسلمان اس کو قرآن مجید کے جو حقوق ادا کرنے ہیں، اس کام کے لیے اس کے دل میں کتنی لگن، تڑپ، دلولہ اور حوصلہ ہے! اگر نہیں ہے تو شعوری طور پر اس کے لیے کوشاں ہو۔ یہ بھی نہ کر سکے تو پھر اپنے ایمان کی خیر منائے۔

میں نے ۱۹۶۸ء میں ”مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق“ کے موضوع پر تقریر کی تھی۔ اس میں قرآن مجید کے پانچ حقوق گنوائے تھے۔ پہلا یہ کہ اسے مانا جائے۔ دوسرا یہ کہ اسے پڑھا جائے۔ تیسرا یہ کہ اُسے سمجھا جائے۔ چوتھا یہ کہ اس پر عمل کیا جائے اور پانچواں یہ کہ اسے دوسروں تک پہنچایا جائے۔ یہ تقریر مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ ان حقوق کے حوالے سے اپنا محاسبہ خود کیجیے کہ کیا ہم ان کو ادا کر رہے ہیں! اگر نہیں کر رہے ہیں تو آج ہی یہ عزم کر کے اٹھیے کہ ہم ان شاء اللہ ان حقوق کو ادا کریں گے۔

یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ میں نے قرآن مجید کے پانچ حقوق گنوائے تھے اور آج میں نے پانچ ہی محاذ آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں جو ہماری اپنی ملت کی اصلاح اور اس کی دینی و ملی زندگی کو سنوارنے کے لیے جہاد بالقرآن کے متقاضی ہیں۔ یہ تو ہماری جدوجہد کا پہلا مرحلہ ہے۔ ہمیں تو اس قرآن کی شمشیر بے زہار تیغ بڑاں کو ہاتھ میں لے کر پورے کرہ ارضی پر کفر، شرک، الحاد، دہریت، اباحت، شیطنیت اور ان کے ذریعے پیدا ہونے والے تمام امراض کا قلع قمع کرنا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ "Physician heals thyself" کے مصداق اس کام کو اپنی ذات سے شروع کیجیے۔ پھر کمر کیسے کہ جہاد بالقرآن کے ذریعے پاکستان کے مسلم معاشرے کی اصلاح کے لیے اپنی بہترین توانائیاں، اپنی بہترین صلاحیتیں اور اپنے بہترین اوقات وقف کریں گے، اور اگر اللہ توفیق اور ہمت دے تو پوری زندگی اسی کے لیے وقف و مختص رہے گی، از روئے آیت قرآنیہ:

﴿إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ (الانعام)

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو نیز تمام مسلمانوں کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اقول قولی هذا واستغفر اللہ لی ولکم وللسائر المسلمین والمسلمات

☆ — ☆ — ☆